اقبال اور اقبالیات

ایک منظر نامہ

شکیلہ فاضل

اقبال اور اقبالیات

ایک منظر نامہ

تسکین فاضل

ISCUS LIBRARY
15816
10936
MALEGAON

فاضل پبلی کیشنز گلشن نگر چھانہ پورہ، بائی پاس

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	اقبال اور اقبالیات (ایک منظر نامہ)
مصنّف	تسکینہ فاضل (0194-2438317)
سنِ اشاعت	۲۰۱۲ء
تعداد	۵۰۰
صفحات	۱۵۲
سائز	۲۳x۳۶/۱۶
قیمت	۳۰۰روپے
طباعت	**الحیات** پرنٹوگرافرس سرینگر 9419525103

ناشر

فاضل پبلی کیشنز

گلشن نگر، چھانہ پورہ، بائی پاس سرینگر

COMPLIMENTARY BOOK
NCPUL, NEW DELHI

انتساب

انگریزی ادب کے جیّد عالم اور نامور اقبال شناس

پروفیسر غلام رسول ملک

کے نام

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو، ہے سخن تصویر کا

امیر مینائی

مندرجات

☆ تعارف

۱۔ عصری مسائل کا حل فکر اقبال کے تناظر میں 1-9

۲۔ عصر حاضر میں اقبال کی معنویت 10-16

۳۔ اقبال ایک آفاقی شاعر کی حیثیت سے 17-21

۴۔ فکر اقبال کی انفرادیت کی ترجمان مثنوی اسرار خودی 22-27

۵۔ خودی شیر مولا جہاں اس کا صید 28-32

۶۔ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف ''اسرار خودی'' کا منظوم کشمیری ترجمہ 33-42

۷۔ اقبال کے فکر وفلسفہ پر اُم الکتاب کے اثرات 43-51

۸۔ اقبال بارگاہ رسالت ﷺ میں 52-60

۹۔ فکر اقبال میں رسول مقبول ﷺ کا مقام 61-68

۱۰۔ نوعِ انسان پر رسول اللہ ﷺ کے احسانات 69-74

۱۱۔ علامہ اقبال اور شہادت حسینؓ 75-80

۱۲۔ اقبال اور امومت 81-85

۱۳۔ نہ میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی وحجازی 86-90

۱۴۔ اقبال اور فیض 91-96

۱۵۔ اقبالیات (مجلّہ اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی)
کا شمارہ نمبر ۱۹۔ ایک جائزہ 97-105

۱۶۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اپنی اقبالیاتی تصنیفات وتالیفات کے آئینے میں 106-117

۱۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی فکر اقبال کے ایک نادر نمونے کی روشنی میں 118-125

۱۸۔ فکر اقبال کا اجمالی جائزہ 126-130

۱۹۔ تعلیم، اقبال کی نظر میں 131-133

۲۰۔ فنون لطیفہ اقبال کی نظر میں 134-142

تعارف

زیرِ نظر کتاب اقبال کی شاعری اور فکر کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے میرے اُن مقالات و مضامین پر مشتمل ہے، جو میں نے گزشتہ تین چار برسوں میں مختلف موقعوں پر منعقد کئے گئے سمیناروں کے لئے تحریر کئے ہیں۔ یہ مقالات و مضامین اُن سمیناروں میں پڑھے بھی گئے اور خدا کے فضل و کرم سے ان کی خاصی پذیرائی بھی ہوئی۔ اِن مضامین میں بعض مقامات پر قارئین کرام کو تکرار کا بھی احساس ہوگا، تاہم کوشش کے باوجود کہیں کہیں تکرار ناگزیر بن چکی ہے۔

علامہ اقبال دُنیا کے اُن خوش بخت شعرا میں شمار ہوتے ہیں، جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور اُن پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔ اقبال اور اُن کا فکر ایک ایسا موضوع ہے جس پر جتنا زیادہ لکھا جائے کم ہے۔ وہ سدا لکھنے والوں کو اپنی جانب راغب کرتے رہیں گے، کیونکہ اُنہوں نے شاعری سے پیغمبری کا کام سرانجام دیا۔

اقبال نے اپنے نظامِ فکر کی اساس فلسفۂ خودی پر قائم کی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اور خودی لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اُن کی پہلی فارسی تصنیف ''اسرارِ خودی'' ۱۹۱۵ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اقبال اس مثنوی کی تخلیق کے دوران اور اس کی تکمیل کے بعد اُس دور کی بڑی بڑی شخصیات کو بڑے ہی تفاخر اور مسرّت کے ساتھ اس مثنوی کی نوید سنا چکے ہیں، خودی کو اپنے منفی معناں (تکبر، نخوت، غرور) سے نکال کر اقبال نے اِسے مثبت اور تعمیری معناں عطا کر کے دُنیا کے سامنے ایک ایسا مخصوص اور منفرد فلسفہ پیش کیا کہ جس سے اِنسان ارتقاء کے مختلف مراحل طے کر کے نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ شروع شروع میں ''یہ اسرارِ خودی'' ہی تھی جس کی بدولت اقبال شرق و غرب میں بے حد مقبول ہوئے۔ اِس مثنوی کے سبب صوفیاء کے حلقے میں ایک ہنگامہ بھی کھڑا ہو گیا، تاہم یورپ اور امریکہ میں بھی اس پر تبصرے اور جائزے شائع ہوئے۔ عربی کے مشہور اسکالر اور مستشرق پروفیسر رینالڈ اے نکلسن نے ''اسرارِ خودی'' کا منظوم انگریزی ترجمہ 'Secrets of Self" کے نام سے کیا جو ۱۹۲۰ء میں اُن کے دیباچے اور ملک راج آنند کے پس لفظ After word کے ساتھ شائع ہوا۔ بعد میں دُنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس مثنوی کے ترجمے کئے

گئے۔ کشمیری زبان میں غلام احمد نازکولگامی نے اس کا منظوم ترجمہ کیا جو اقبال اکادمی پاکستان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

ہرمن بیس نے اقبال کو اسلامی، ہندی اور مغربی تین اقلیموں کا شاعر قرار دیا ہے۔ دراصل اقبال کا فکر انہیں تین دھاراؤں کا نہایت حسین سنگم ہے، اُن کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قران مقدس ہے، چنانچہ اقبال زندگی بھر قرانی تعلیمات کی ترجمانی کرتے رہے۔ غالباً اِسی سبب کے تحت بعض ناقدین (بشمول ڈکنسن) نے اقبال کو ایک فرقے یعنی مسلمانوں کا شاعر کہا ہے۔ اقبال کا مسلمانوں کا شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن کوئی اُنہیں مسلمانوں کا شاعر کہہ کر اُن کی فکر کے کینوس کو محدود کردے، یہ ہرگز قابل قبول نہیں، کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات ہی ہیں جو فکر اقبال کو ذات پات، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد کر کے اقبال کو آفاقی شاعر کا درجہ عطا کرتی ہیں، کیونکہ اسلام بنی نوع اِنسان کے لئے سلامتی کا پیغام ہے۔

آجکل فکر اقبال کے حوالے سے یہ سوال یا مسئلہ بھی درپیش ہے کہ عصرِ حاضر میں فکر اقبال کی کیا معنویت ہے۔ دور حاضر میں اِنسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہوشربا ترقی کی ہے۔ اِنسان چاند پر کمند ڈال چکا ہے۔ اُس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرلیا ہے، لیکن وہ اپنی شب تاریک کو سحر کرنے سے عاجز ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اِنسان ہی اِنسان کا شکاری بن چکا ہے۔ اِنسان ہی کی وجہ سے اِنسان درد و کرب کا شکار ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر کوئی شاعر احترام آدمیت اور عظمت اِنسان کی تعلیم دے، تو یہ اُس کے فکر کی معنویت کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے، کیونکہ اِنسان اور انسانیت مقدم ہے۔ عصرِ حاضر کے وہ مسایئل، جنہیں سائینس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی کے باوجود حل کرنا ناممکن ہوگیا ہے لیکن اقبال کی شاعری انہیں حل کرنے سے بہرہ ور ہے۔ اقبال وہ دانائے راز ہیں جنہوں نے ایک آفاقی مفکر کی حیثیت سے عالمِ انسانیت کو صداقت شعاری اختیار کرنے اور انسانِ کامل بننے کی تلقین فرمائی ہے۔ اِنسانیت کی معراج مال و زر کے حصول میں نہیں بلکہ قوت ایمان اور اپنے نصب العین پر یقین کامل میں ہے۔

اقبال رسول مقبولؐ اور آپؐ کے خانوادے کے تئیں بے حد محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے حقیقی عشق کے لئے وہ اتباع رسول کو ناگذیر سمجھتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ کو اُنہوں نے شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں اِس موضوع سے متعلق چند مضامین درج ہیں، جن کے عنوانات اِسطرح ہیں: اقبال بارگاہ رسالتؐ میں، فکر

اقبال میں رسول مقبولؐ کا مقام، نوعِ انسان پر رسول اللہ کے احسانات، وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے مشمولات میں پاکستان کے معروف ادیب، شاعر اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبالیاتی تصانیف کے حوالے سے دو۲ مقالات درج ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی اقبالیاتی تحریریں سنجیدہ نوعیت کی حامل ہیں، اِن تحریروں کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر فراقی نے اقبال کی شعری اور نثری تحریروں کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ پاکستان ہی کے ایک اور اقبال شناس ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ'' کے انگریزی حصے میں شامل تین مضامین کا اُردو ترجمہ بھی شامل کتاب ہے۔ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی اقبالیاتی تحریروں سے بہت متاثر ہوئی ہیں، چنانچہ اُن کے تین انگریزی مضامین کو میں نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ اقبالیاتی حلقوں میں میرے اِن مضامین کے پیشِ نظر میری حوصلہ افزائی ہو گی۔ اقبالیات کے شعبے میں مختلف سطحوں یا درجوں کے اقبال شناس موجود ہیں، اقبالیاتی ادب کے وافر ذخیرہ میں افراط و تفریط بہت ہے، لیکن یہ مضامین لکھتے وقت میری شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین اقبال اگرچہ کسی طرح مستفید ہوں، تو میں یہ سمجھوں گی، کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔

تسکینہ فاضل

سرینگر

نومبر ۲۰۱۲ء

عصری مسائل کا حل فکرِ اقبال کے تناظر میں

عصرِ حاضر کے مسائل کا حل فکرِ اقبال کے تناظر میں تلاش کرنے سے پہلے جس اہم نکتے کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کے فکر کا اطلاق عصرِ حاضر پر کس طرح ہوسکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اکثر لوگ شاعری کو تفنن طبع کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ اپنی محدود اور منفی سوچ کی بناء پر شاعری کو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی قوت سے عاری سمجھ کر اسے فرسودہ اور از کار رفتہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو اس طرح کے اندازِ فکر و نظر میں ایک حد تک حقیقت کا پہلو بھی کارفرما ہے کیونکہ ہماری شاعری کا ایک حصہ یقیناً ایسا ہے جو عصرِ حاضر کے انسان کی زندگی کیلئے اپنی معنویت بڑی حد تک کھو چکا ہے، کیونکہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے، انسان کی زندگی نت نئے مسائل سے دوچار ہوتی جارہی ہے۔ عصرِ حاضر کے انسان کی زندگی پہلے کی نسبت ان گنت پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے۔ عصرِ حاضر تک آتے آتے انسان نے بتدریج علم کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ علم کا منظر نامہ بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل ہوکر وسیع ہوتا جارہا ہے۔ آئے دن نئے نئے نظریات سامنے آرہے ہیں۔ اس تغیر پذیر اور توسیع پذیر صورت حال کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پورے علمی منظر نامے میں پیدا ہورہی تبدیلی کے باوجود فکرِ اقبال کا اطلاق عصرِ حاضر اور اس کے مختلف مسائل پر کس طرح ہوسکتا ہے؟ واضح رہے کہ اقبال زندگی میں ارتقاء پذیری کے پیش نظر خود بھی علم میں جمود کے خلاف تھے کیونکہ زندگی ہمیشہ ارتقاء کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ چنانچہ پرانے نظریات نئی توضیحات اور تشریحات کیلئے راہ ہموار کردیتے ہیں۔ "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے پیش لفظ ہی میں علامہ اقبال نے یہ بات صاف کردی ہے۔ لکھتے ہیں:

"As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views and probably sounder views than those set forth in these lectures are possible."

علم کی خواہ کتنی ہی ترقی ہو، ماضی کا قابل قدر سرمایہ ہر دور میں اپنی اہمیت اور افادیت برقرار رکھتا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تاہم انسان اور اس کی معاشرتی زندگی کے اکثر پہلو ایسے ہیں جن پر مرورِ ایام کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ انسان کی فطرت میں کس حد تک تبدیلی آسکتی ہے، اس کا تجربہ انسان سے بہتر کس کو ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سماجی رویوں کے انداز بھی کچھ زیادہ نہیں بدلتے۔ حیاتِ انسان کی بنیادی ضروریات، اس کے جذبات اور احساسات آج بھی کم وبیش ویسے ہی ہیں جیسے پرانے زمانے کے انسان کے تھے۔ صرف ان کی تسکین واطمینان کے انداز تبدیل ہو چکے ہیں یا بہتر ہو چکے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی فن پارہ، جو انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرلے، اور اسے خیر کے ذریعے ارتقاء کی طرف لے جائے، وہ زمان ومکان کی حدود وقیود کو توڑ کر اور تمام طرح کے امتیازات سے بالاتر ہو کر دوامی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔

فکرِ اقبال کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے اپنی ذات میں الوہی صفات کو تحلیل کر کے اپنی غیر معمولی استعداد کو نوعِ انسانی کی خیر اور فلاح کیلئے بروئے کار لائے، اور اس زمین پر نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دے۔ ظاہر ہے ایسے آفاقی پیغام کی اہمیت اور قدر و قیمت زمانے کی رفتار کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ کیونکہ اقبال کی فکر کے سوتے قرآن کے سرچشمے سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایک بنیادی سبب ہے کہ اقبال کا فکر نہ صرف عصر جدید سے ہم آہنگ ہے بلکہ آنے والے وقتوں کیلئے بھی گہری معنویت کا حامل ہے۔

عصرِ حاضر میں انسان کی زندگی اَن گنت مسائل میں اس حد تک گھری ہوئی ہے کہ کس کس مسئلے کا ذکر کیجئے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی کسی مفلس کی قبا ہو جیسے　　جا بجا درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

دین سے برگشتگی، قرآن سے دوری اور مقصد حیات سے بیگانگی کے نتیجے میں انسان کے افعال واعمال غیر انسانی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عصرِ حاضر میں اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لا کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لیکن یک رُخی ترقی انسان کی زندگی کے اصل مقصد یا غایت کی تکمیل نہیں کرسکتی۔ اقبال اسلام کے حوالے سے خدا، کائنات، مادہ اور روح کو ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں، جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر، جو کسی دوسری جگہ واقع ہے، ترک کر دینا چاہیے۔ بلکہ مادہ اسلام کی رُو سے اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید زمانی ومکانی میں ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر کا انسان مادیت کی پرستش میں

ں کے روحانی پہلو کو نظر انداز کر کے مقصد حیات کو فراموش کر چکا ہے۔ مادیت انسان کی زندگی کو بہتر سے بہتر وسائل فراہم کر سکتی ہے لیکن اسے سکون قلب کی دولتِ بے بہا عطا کرنے سے قاصر ہے۔ یہ دولت بے بہا خدا کی خوشنودی سے حاصل ہو سکتی ہے اور خدا کی خوشنودی جب ہی حاصل کی جا سکتی ہے جب انسان نیکی کے راستے پر گامزن ہو کر اوروں کو بھی اس کی ترغیب دلائے۔ برے افعال سے خود کو محفوظ رکھے اور دوسروں کو بھی ان سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ قرآن انسان کو افلا تعقلون، افلا تدبرون اور افلا تفکرون کے ذریعے تفکر اور تدبر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے تا کہ وہ خدا، کائنات اور اپنی ماہیت اور ان کے باہمی رشتے کی حقیقت کو سمجھ سکے۔ قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کے نتیجے میں وہ باطنی طور پر خود سے متصادم ہے اور خارجی طور پر زندگی کے مختلف شعبوں میں بندگانِ خدا سے برسر پیکار ہے۔ اس طرح اس کی بے رحم انانیت اور نہ ختم ہونے والی ہوسِ زر اس کی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا قلع قمع کر رہی ہے۔

پاکستان کے نامور ادیب، محقق اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک اقبال نے اپنے فکر کی اساس دو عناصر پر رکھی ہے۔ (۱) وقتی اور ہنگامی عنصر (۲) دائمی اور ابدی عنصر۔ اقبال اپنے عصری حالات کی گہری آگہی رکھتے تھے۔ ایک دیدہ ور شاعرِ فردا کی حیثیت سے وہ ماورائے عصر کے زندہ اور توانا شعور و احساس سے بھی غیر معمولی طور پر بہرہ مند تھے۔ انہوں نے اپنے نظام فکر کی اساس اسلام کے جن ابدی حقائق پر رکھ کر اس کی ترتیب و تشکیل کا کام انجام دیا ہے، وہ رنگ و نسل، زبان اور زماں و مکاں کی حدود و قیود اور امتیازات سے بالاتر ہو کر آفاق گیر اور ابدی ہو چکے ہیں۔ کیونکہ:

A hundred world
which are unseen as yet its verses hold.
And Aeons in its moments are concealed
encompasses this modern age, believe
if thou dost own a comprehending mind.

اقبال کا دور برعظیم کے باشندگان کیلئے بالعموم اور ملت اسلامیہ کیلئے بالخصوص بحران کا دور تھا۔ ہندوستان نو آبادکاری کے آہنی شکنجے میں بری طرح جکڑتا جا رہا تھا۔ اُن جیسا مسلمان دانشور، انسانیت کی صالح اقدار کا پاسدار اور پاسبان، قرآن و سنت کا پابند کیونکر برطانوی طرزِ حیات سے سمجھوتہ کر سکتا تھا۔ نام نہاد دانشوری سے کب وہ مرعوب ہو سکتے تھے۔ اس کے دام میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا نظام فکر صحیفۂ کائنات قرآن مقدس کے علاوہ احادیث نبوی اور حکمت بالغہ سے ترتیب و تشکیل پا چکا ہے۔ وجود باری پر اُن کا نہایت راسخ عقیدہ و ایمان ہے۔ وہ حیات انسانی کی اخلاقی اور روحانی اقدار کی برتری پر یقین

محکم رکھتے ہیں۔ وہ عالم انسانیت کے امن و آشتی اور اخوت و مساوات کے نہ صرف متمنی اور پیغامبر ہیں بلکہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ بھی وہ دِکھلا چکے ہیں۔ وہ انسان کو مقصودِ کل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انسانیت کے علمبردار اور ترجمان کی حیثیت سے انہوں نے ان نوآبادکار قوتوں کے ہاتھوں امنِ عالم کو درپیش خطرۂ عظیم سے دنیا کو آگاہ کیا۔ یہ نوآبادکار طاقتیں جہاں بھی گئیں، اپنے مادی اغراض کے تحفظ کی خاطر اپنی سائنسی، اقتصادی اور فوجی طاقتوں کے ساتھ ساتھ قومی تعصب اور عالمگیر سطح پر روا رکھے جارہے جبر و استبداد اور بربریت پر مبنی انسانیت سوز فکر و عمل بھی لے گئیں۔ ان کے متضاد اور متصادم مفادات ان مادہ پرست گروہوں کو پہلی جنگ عظیم تک لے آئے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی آفت آپڑی جس نے پوری دنیا کے نظام کو اپنی لپیٹ میں لیکر درہم برہم کردیا۔ اس تمام ترقی کے باوجود، جو انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اور فطرت کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کرنے اور اس کی قوتوں کو اپنے تصرف میں کرنے میں کی ہے، اقبال یہ محسوس کرتے تھے کہ جبر و استبداد اور قتل و غارت کے تمامتر ہتھکنڈے روا رکھنے والی ملوکیت اپنے مہیب چہرے پر جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت کے نقاب ڈالے ہوئے ہے جن کی آڑ میں کرۂ ارض پر بسنے والے بندگانِ خدا کے شرفِ انسانیت اور حریتِ آدم کی دھجیاں اُڑا کر اسے کمال بے دردی کے ساتھ پیروں تلے روندا جارہا ہے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو علامہ نے سالِ نو کے موقعے پر آل انڈیا ریڈیو لاہور اسٹیشن کو دیے گئے اپنے پیغام میں نوعِ انسان پر جاری اس دردناک اور افسوسناک صورت حال کے حوالے سے خون دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر نہایت دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ ان قوتوں کے غیر انسانی افعال و اعمال کو بے نقاب کیا۔ لطیف احمد شیروانی "Speeches Writings and Statements of Iqbal" میں لکھتے ہیں:

"The so-called statesmen to whom Govt. and leadership of men was entrusted, have proved demons of bloodshed, tyranny and oppression. The rulers whose duty it was to protect and cherish these ideals which go to form a higher humanity to prevent man's oppression of man and to elevate the moral and intellectual level of mankind, have in their hunger for dominion and imperial possession, shed the blood of millions

and reduced to servitude simply in order to pander to the greed and avarice of their own particular groups. After subjugating and establishing their dominion ever weaker people, they have robbed them of their religions, their morals, of their cultural traditions and their literature."

اقبال اس زمانے میں ابی سینیا، فلسطین، اسپین اور چین میں رونما ہوئے واقعات سے خاصے مضطرب تھے۔ الجیریا، بوسنیا، ہرزی گووینا، افغانستان اور کشمیر کے باشندگان کو بھی انہی قوتوں کے ہاتھوں بربریت کا شکار بنادیا گیا جنہیں تہذیب یافتہ، ترقی یافتہ، دوراندیشی اور وسعت ذہنی رکھنے کا دعویٰ رہا ہے۔

حکمت اقبال اس وحشیانہ پن اور بربریت کا سدِ باب احترام آدمیت میں تلاش کرتی ہے۔ یہ دنیا اس وقت تک جنگلی جانوروں کا اکھاڑہ ہی بن کر رہے گی جب تک نہ نوعِ انسان کی تعظیم وحرمت کیلئے دنیا بھر کی علمی قوتیں سرگرمِ عمل ہوں۔ اسپین کے لوگ ایک نسل، ایک قومیت، ایک زبان اور ایک مذہب رکھنے کے باوجود Economic Creed میں تفریق یا امتیاز کی بناء پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر اپنی تہذیب وثقافت کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کررہے ہیں۔ یعنی قومی وحدت کو بھی اقبال کسی پائیدار قوت سے تعبیر نہیں کرتے۔ ہاں البتہ اگر کسی قوت پر اعتماد یا بھروسہ کیا جاسکتا ہے تو وہ قوت، اخوتِ انسان کی قوت ہے جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان کی تمیز سے بالاتر ہے۔ جب تک اس حقیقت کا عملی مظاہرہ نہ کیا جائے کہ یہ دنیا خدا کا عیال ہے، جب تک نسل، رنگ اور جغرافیائی قومیتوں کے امتیاز وافتراق کا مکمل طور سے خاتمہ نہ کیا جائے، انسان خوشحال اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے کے اہل ہو ہی نہیں ہوسکتا اور حریت، مساوات اور اخوت عملی طور پر وقوع میں نہیں آسکتی۔ پوری دنیا میں انسان اور نوعِ انسان کی ابتر صورتحال کے پیش نظر فضیلت انسان کے علمبردار علامہ اقبال بغیر کسی رنگ ونسل، ذات پات اور جغرافیہ کے انسان کو انسان کی تعظیم وحرمت کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

آدمیت احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی
برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصل تہذیب احترامِ آدم است

اقبال کے انتقال کے بعد گزشتہ طویل عرصے سے عالمی سطح پر انسان نوعِ انسان کا شکاری ہوکر اس پر مسلسل قہر برپا کررہا ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں ممالک میں انسانی اقدار اور اصولوں کی پامالی اور بے حرمتی کا سلسلہ پہلے سے زیادہ شدومد کے ساتھ برابر جاری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی نہ ختم ہونے

والی زیادتیاں دنیا میں زندگی کی مرکزی حیثیت اور اس کے اصل مقصد کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہیں۔ مغرب جیسی ترقی یافتہ سوسائٹی میں ہوس کاری، دولت کی ریل پیل، نفسانفسی اور سرد مہری کے روز افزوں رجحان نے انسان کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر کر زمین بوس ہو چکا ہے۔ طلاق کی شرح میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان رشتے میں ضعف پڑ چکا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان اجنبیت یا غیریت کی لمبی دیواریں حائل ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہر شخص دنیا کی بھیڑ میں بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی رُو سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کی دولت کا ساٹھ فیصد حصہ صرف پانچ فیصد لوگوں کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ غریبی کی نچلی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ جبکہ کائنات کی تمام چیزیں ہر انسان کے مصرف کیلئے مساوی ہیں لیکن انسان نے اپنے حقیقی مقام و مرتبے سے گر کر دنیاوی اشیاء کو معبود بنا رکھا ہے اور معاشیات کو dehumanise کر دیا ہے۔ معاشیات کے تئیں انسان کے اس مادہ پرستانہ رویے کے تحت دولت اکٹھا کرنے کے غیر انسانی عمل کی اقبال سخت مخالفت کرتے ہیں۔ خواہ اسے جائز وسائل ہی سے کیوں نہ حاصل کیا جائے۔ سرمایہ داری کی مخالفت سے زیادہ وہ اشتراکیت کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ کیونکہ مساواتِ شکم کے ساتھ ساتھ روح کی غذا کے نتیجے میں ہی ایک بہتر معاشرہ معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ اقبال کے معاشی تصورات کے پس پشت اسلام کا متحرک اور زندگی کے تئیں انتہائی ذمہ دارانہ تصور کارفرما ہے۔ وہ ایک ایسے معاشی نظام کی وکالت کرتے ہیں، جو مساوات پر مبنی ہونے کے علاوہ منصفانہ ہو، جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

No one should be a destitude in this world.

This is, indeed, the focus of the divine law.

اقبال عصرِ حاضر کے انسان کی اخلاقی ترقی میں مغرب کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں، اس لئے حیاتِ انسانی میں تین چیزوں کی اہمیت پر خاص زور دیتے ہیں:

1. A spiritual interpretation of the universe.
2. Spiritual emancipation of the individual.
3. Basic principles of a universal import directing the evolution of human society on a spiritual basis....

اقبال عالمی سطح پر رونما ہو رہے فسادِ فکر و عمل کے علل و اسباب پر نہایت عمیق غور و فکر کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے انسان سے تمام مسائل کا سدباب کرنے کیلئے دین اسلام کی سرمدی تعلیمات کو وسیلہ بنا چکے ہیں کیونکہ

اسلام سلامتی کا دین ہے جو نوع انسان کو بغیر کسی امتیاز کے تحفظ فراہم کرتا ہے اور خیر الامم ہونے کے ناتے ساقی گری کی خدمت کی انجام دہی مسلمان کے سپرد کی گئی ہے۔ اسلام احترام آدمیت پر خاصا زور دیتا ہے۔ اقبال اسلامی یا آفاقی شاعر ہونے کے ناتے احترام آدمیت کو تہذیب کی نہاد قرار دیتے ہیں۔

قرآن کی رُو سے نوع انسان قوم واحد ہے۔ مختلف کنبوں اور قبائل میں انسانوں کی تقسیم اور گروہ بندی، زبانوں اور رنگ و نسل کی بوقلمونی سے ان کے برتر یا فروتر ہونے کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ فقط معرفت یا شناخت کے لئے ہے جبکہ برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ خدا رب العالمین اور اس کا نبیؐ رحمت للعالمین ہے۔ خدا مردم کشی اور زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنے سے انسان کو سختی سے منع کرتا ہے۔ ایک انسان کا قتل نوع انسان کا قتل ہے اور ایک انسان کی زندگی کو تحفظ فراہم کرنے والا تمام انسانیت کی محافظت کرنے والا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے نوع انسان کو خدا کا عیال قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ آنحضورؐ کیلئے روئے زمین مسجد کا درجہ رکھتی ہے۔ آپؐ نے انسان کو تمام مخلوقات پر رحم کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

فکر اقبال کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال آخر چاہتے کیا تھے؟ اس سوال کا سیدھا سا جواب میرے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ نوع انسان کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر اقبال جیسے حساس اور دردمند انسان خدا کی اس زمین پر ایک صالح اور برتر معاشرے کی تشکیل نو کے آرزو مند تھے اور اس کی اساس انہوں نے اسلام کے ابدی اصولوں پر رکھی ہے۔ دراصل dehumanization ہی دنیا میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کی جڑ ہے، انسان مقصود کل ہے اور جب اسی مقصود کل کو نظر انداز کیا جائے تو اقبال قرآن کے زیر اثر اپنے تخلیقی سفر کی ابتداء سے لیکر کے اختتام تک اسی انسان کو تدریجی ارتقاء کے ذریعے اپنے اصل مقام و مقصد تک پہنچانے کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ انسان اور حیات انسانی گہری معنویت کی حامل ہے۔ چونکہ انسان کو اشرف المخلوقات کے عظیم مقام سے نوازا گیا ہے، اس لئے علامہ فرد کو خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی بے پناہ استعداد کو پہچاننے اور اسے قانونِ الٰہی کے تابع کر کے نوع انسان کی فلاح کیلئے بروئے کار لانے کا پیغام دیتے ہیں۔ فرد اپنی خودی کو جماعت یا ملت کی خودی کے ساتھ مربوط کر کے اُسے آبرو اور بقا عطا کرے۔ اقبال فرد کو محض ایک پرزہ اور جماعت کا بے شعور کارندہ نہ سمجھ کو اجتماع یا ملت کا وہ سنگِ بنیاد قرار دیتے ہیں، جس کی صحیح تربیت سے ایک صالح معاشرہ کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ فرد اگر شعور ذات سے بہرہ مند ہے تو شعور ذات کے نتیجے میں وہ جان لیتا ہے کہ جماعت یا ملت کیلئے قربانی ہی میں اس کی آبرو اور بقا ہے ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب، قلزم شود

اجتماعی خودی سے فرد کی خودی اس طرح محکم ہو کر سنورتی ہے کہ تمام افراد اپنے اپنے وجود کو بامعنی سمجھ کر خود کو اس زمین پر خلافت الٰہی کا امین سمجھتے ہیں اور تمام طرح کے امتیازات سے بالاتر ہو کر نوعِ انسان کی خیر اور دین کی سرفرازی کو اپنا مقصدِ حیات گردانتے ہیں۔ اقبال اسلام کے مقصود و منتہا کے پیشِ نظر دنیا میں روحانی جمہوریت کا قیام عمل میں لانے کے متمنی ہیں۔ روحانی جمہوریت سے ان کی یہ مراد ہے کہ کرۂ ارض پر ایسے کم و بیش مثالی افراد کے ذریعے روئے زمین کے سب سے بڑے نادرالوجود مثالی فرد کے تابع ہو کر خلافتِ الٰہی کا قیام عمل میں آئے۔ چنانچہ Reconstruction of Religious Thought in Islam میں مسلمانوں سے ساقی گری کی خدمت کا فریضہ انجام دینے کیلئے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنی عمرانی زندگی کو از سرِ نو تشکیل دینے کی ہدایت ذیل کے الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

"Let the Muslim of today appreciate his position, reconstruct his social life in the light of ultimate principles, and evolve out of the hitherto partially revealed purpose of Islam that spiritual democracy... is the ultimate aim of Islam."

عصرِ حاضر کے مسائل کا حل اقبال کے فلسفۂ خودی کے تناظر میں تلاش کیا جا سکتا ہے، انسان اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا کر ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتا ہے۔ معترضین اقبال اس مثالی معاشرے کے عصرِ حاضر میں قیام میں آنے کے سلسلے میں تشکیک کا شکار ہو کر اسے یوٹوپیائی یا خیالی جنت قرار دے چکے ہیں، جو سراسر قنوطیت اور خیر کی طرف عود کر نہ آنے کا منفی، تخریبی اور مایوس کن رجحان ہے۔ زندگی یا دنیا امید اور خیر پر اپنا انحصار رکھتی ہے اور اقبال امید کے شاعر ہیں۔ اُن کے نزدیک شجر سے پیوستہ رہ کر ہی امیدِ بہار کی جا سکتی ہے۔ اقبال کا پیش کیا ہوا مثالی معاشرہ خلفائے راشدین کے دور میں وقوع میں آچکا ہے۔ ایک ایسے ہی مثالی معاشرہ کو از سرِ نو وقوع میں لانے کیلئے ان کے عالمِ خیال میں مختلف اوصاف سے متصف افراد ضرور رہے ہیں جنہیں انہوں نے مردانِ خود آگاہ،

مردانِ حق، مردانِ حُر، عاشقانِ زندہ دل اور قلندرانِ حق آگاہ جیسے کئی القاب سے ملقب کیا ہے۔ انہوں نے ان افراد کے جیتے جاگتے نمونے بھی ہمارے سامنے رکھے ہیں جیسے صحابہ کرام، حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت بلالؓ، وغیرہ وغیرہ۔

ظلمت کا مارا عصرِ حاضر کا انسان اگر اپنی موجودہ حالت پر غور کرے کہ اشرف المخلوقات کے عظیم مقام سے سرفراز ہونے کے باوجود اس کے سیہ روز، سیہ بخت اور سیہ کار ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ کیوں اس کی تقدیر کا ستارا جل چکا ہے؟ تو غیب سے یہی صدا آئے گی ؎

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے، پھر نہ سیہ کار رہے

عصرِ حاضر میں اقبال کی معنویت

اقبال جہاں اپنے دور کے ایک کامیاب مفکر شاعر کی حیثیت سے تسلیم کئے گئے۔ وہاں عصر حاضر میں اُن کا مقام علم کی وسعت اور سائینس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود، اور بھی بلند ہو چکا ہے۔ اقبال نے بجا طور پر خود کو شاعرِ فردا یعنی کل کا شاعر کہا تھا۔ اُن کا ایک شعر ہے ؎

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا، شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

نئے حوادث ٹپکنے سے اقبال کی مراد نئے انداز سے جینے سے ہے۔ جب جب وقت کے بڑھتے ہوئے تقاضوں سے اِنسان اور انسانیت کا سامنا ہوگا، فکرِ اقبال کی معنویت کا موضوع زیرِ بحث آئے گا۔ شاعری کو بالعموم تفنن طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور اس کے بیشتر حصّے کے پیش نظر اسے وقت کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دینے والی از کارِ رفتہ چیز سمجھا جاتا رہا ہے، لیکن واضح رہے، اقبال، جو شاعری کو جزویست از پیغمبری اور زندگی کا خادم سمجھتے ہیں، آنے والے اعصار و دہور پر چشم بصیرت رکھنے والے وہ نابغہ مفکر شاعر ہیں جن کے سدا بہار افکار کی معنویت ہر دور میں مسلم رہے گی اور جیسے جیسے وقت گزرتا چلا جائے گا، ان کی اہمیت اور معنویت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔ کرۂ ارض پر جب تک فرزندِ آدم کی تخلیق ہوتی رہے گی، اقبال کے افکار نوعِ انسان اور انسانیت کے لئے گہری معنویت کے حامل رہیں گے۔ اقبال کے یہاں ترتیب دیا ہوا ایک باقاعدہ نظامِ فکر ملتا ہے جس میں خودی کے فلسفے کو Pivot یا چول کی حیثیت حاصل ہے۔ خودی اقبال کے نزدیک اپنے دور کے مروجہ معنوں یعنی استکبار اور غرور کے برخلاف عرفان نفس یا تعین ذات کا نام ہے جس سے خدا کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اقبال خدا کی طرف سے اِنسان کو ودیعت کی گئی غیر معمولی استعداد کو پہچاننے اور اس کی نشو و نماء کر کے اِسے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کی پُر زور تلقین کرتے ہیں۔ اِنسان کی خودی کے مرتبۂ کمال یا نقطۂ عروج تک پہنچنے سے اقبال کا مقصود و منتہا عالمی سطح پر ایک ایسے برتر اور صالح معاشرۂ انسانی کی تعمیر و تشکیل ہے جہاں کوئی کسی کا استحصال نہ کر

سلے۔ اور فقط خدا کو قادر مطلق سمجھ کر اُس کے احکامات پر عمل کر کے زندگی بسر کی جائے۔ یہ اُس غایت کی تکمیل کا کام انجام دیتا ہے جس کے تحت کرۂ ارض پر آدم کی تخلیق کی گئی ہے۔ جب انسان سے اُس کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوتا، تب وہ مقام آدمیت سے گر کر حیوانوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں اِنسان نے سائینس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں۔ تاہم جہاں اقبال نے مغربی ملوکیت، وطنیت پرستی اور رنگ و نسل کی تفریق کو ہدف تنقید بنایا ہے، وہاں مغرب کے تصور علم کی بھی قلعی کھول دی ہے۔ مغرب کا تصور علم تشکیک پر اپنی اساس رکھے ہوئے ہے۔ اِس تشکیک کا ایک مثبت اور افادی پہلو یہ ہے کہ جہاں فطرت کے بہت سے اسرار کو آشکار کیا گیا ہے، وہیں اس کا ایک منفی اور مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ اقدار کی ابدیت اور ایمان وایقان کی قوت بھی معرض شک میں پڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں دلوں میں ایک ایسی بے یقینی پیدا ہوئی جسے اقبال غلامی سے بھی بدتر قرار دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ فطرت کی تسخیر کے باعث انسان کا اپنی ذات پر اعتماد بڑھا اور بڑھتی پھیلتی کائنات کا تصور پیدا ہوا وہیں یہ نقصان بھی ہوا کہ مادی کائنات کی تسخیر اور پرستش ہی جدید انسان کا منتہائے نظر قرار پائی۔ مادہ پرستی کی اس دوڑ میں مشرق اور مغرب دونوں شریک ہیں۔ لیکن جب تک زیرکی یا عقل کے ساتھ عشق کی کارفرمائی شامل حال نہ ہو، حیات انسانی میں اعتدال اور توازن کا برقرار رہنا ممکن نہیں، کیونکہ حیات اِنسانی کا ایک جسمانی پہلو ہے اور ایک روحانی پہلو ہے۔ نامور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک۔ ''عصرِ حاضر میں دُنیا کو ایک ایسے مذہب یا مسلکِ فکر وعمل کی تلاش ہے جس کے اساسی اصولوں سے سائنس بھی انکار نہ کر سکے۔ چنانچہ ایک ایسے سائینسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس میں وجدانیات کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے۔ عقل اور عشق کا یہ اجتماع اِنسان کے درخشاں مستقبل کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم اِنسانی کے لئے آب و ہوا کا وجود''۔ عشق کے دردمند پیامبر علامہ اقبال ''ضرب کلیم'' کی ایک مختصر نظم ''زمانہ حاضر کا انسان'' میں اِنسانی زندگی میں عشق کے ناپید ہونے اور عقل کی فراوانی کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتحال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

عصرِ حاضر کا انسان اپنی کورنگاہی کے باعث مادّیت سے اس قدر مغلوب ہے کہ رُوح یا روحانی زندگی اُس کے لئے بے معنی سی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ خود سے بیگانہ ہے، خدا سے بیگانہ ہے، اپنے فرائض کی انجام دہی سے گریزاں ہے۔ اُس کا رشتہ اپنے معاشرے سے منقطع ہو چکا ہے حالانکہ وہ معاشرے کا جزولاینفیک ہے اور اسی سے مربوط رہنے میں اُس کی آبرو باقی ہے۔ وہ اپنی عملی زندگی سے مذہب کو جدا کر کے، اور اسے "Domestic Affair" سمجھ کر مادیت کی پرستش میں مصروفِ عمل ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر طرح کا آرام و آسائش میسّر ہونے کے باوجود وہ اطمینانِ قلب اور روحانی آسودگی کی دولتِ بے بہا سے یکسر محروم ہے۔ واضح رہے حیاتِ انسانی میں مادّیت اور روحانیت کوئی دو جُدا جُدا یا متضاد چیزیں نہیں بلکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دینِ اسلام کی رُو سے خدا، کائنات، مادہ اور روح ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں۔ اِنسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں، جس کو اُسے ایک روحانی دُنیا کی خاطر، جو کسی دوسری جگہ واقع ہے، ترک کر دینا چاہیئے۔ اقبال کے نزدیک اسلام کی رُو سے مادّہ رُوح کی اُس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ زمانی و مکانی میں ہوتا ہے۔ اسلام انسانی ذہن کو ہر طرح کے امتیازات سے بالاتر قرار دیتا ہے۔ اس کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے ہرگز جُدا نہیں۔

اقبالِ اِنسانی وجود کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں۔ اِس جہاں کی اہمیت اور معنویت حضرتِ آدم کی بدولت ہے۔ یہ فرزندِ آدم ہی ہے جس کے اشکِ خونین سے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی کیا ہے۔ خدا کی اس برگزیدہ مخلوق کو، جسے دردِ دل کے واسطے پیدا کیا گیا ہے، ہوس کے ہاتھوں پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر اِنسانیت کے دردمند مفکر شاعر علامہ اقبال کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ چنانچہ اِنسان کے درد و کرب اور خلش میں تخفیف کرنے کی غرض سے اُنہوں نے اپنی تمام تر عمرِ گرانمایہ وقف کر کے انسان کو اپنے فکر کا موضوع بنایا۔ قرآن چونکہ دُنیا کی سب سے بڑی کتاب الانسان ہے، اس لئے علامہ اقبال نے بھی قرآن کا شاعر ہونے کے ناتے، اپنے اسلاف کے برخلاف، جنہوں نے خدا کو موضوع بنایا تھا، اِنسان کو اپنے فکر کا موضوع بنایا۔ اِنسان کی دردناک صورتحال سے آگہی حاصل کرنے کی غرض سے اور اس سے نمٹنے کے لئے اِس دردمند مفکر شاعر کی آنکھیں رات کی تاریکیوں میں اسرارِ حیات سے پردہ کُشائی کے لئے اشکبار ہوتی رہی

ہیں۔ فرزندِ آدم کے لئے یہ دُنیا دعوتِ دیدار ہے اور یہاں ہر مستور کو ذوقِ عریانی عطا کیا گیا ہے۔ آدم کا مقام گردوں سے برتر ہونے کے ناتے اقبال احترامِ آدمیت کو تہذیب کی اصل قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اِنسان کی بقا احترامِ آدمیت میں مضمر ہے۔ احترامِ آدمیت کو نظر انداز کر کے یہ دُنیا جنگلی جانوروں کے اکھاڑہ سے کچھ کم نہ ہوگی اقبال ۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے خطبۂ چہارم "The human Ego-his freedom and immortality" کے اختتامی حصے میں خودی کی بقا کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس ہستی کے ارتقاء میں ایک مدتِ دراز صرف ہو چکی ہے، کیا اُسے بیکار کی شے سمجھ کر یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ لیکن اقبال خودی کی بقا کو مشروط قرار دے کر کہتے ہیں کہ اِنسانی خودی ارتقاء کی اور اپنا سفر برابر جاری رکھے۔ جب ہی وہ (اِنسانی خودی) کائنات کے لئے معنویت کی حامل ہو سکتی ہے۔ دراصل اقبال ایک حقیقی اِنسان دوست ہیں ۔ اور مقامِ آدمیت کی اہمیت، اور افادیت کو سمجھنے میں اُنہیں غیر معمولی انفراد اور اختصاص حاصل ہے۔ وہ اِنسان کی ناگفتہ بہ صورت حال کا مشاہدہ کرتے ہوئے اِسے قرآن میں تفویض کئے گئے مقام یعنی نیابت الٰہی پر دوبارہ متمکن دیکھنے کے شدید آرزومند ہیں۔ مذکورہ بالا خطبے کے آغاز میں قرآن مقدس سے عظمت آدم کا حوالہ پیش کرتے ہیں کہ اِنسان خدا کی برگزیدہ مخلوق ہے۔ انسان کا وجود تمام تقصیروں اور کوتاہیوں کے باوجود اس کرۂ ارض پر نیابتِ الٰہی کے لئے مخصوص ہے۔ انسان ایک آزاد شخصیت کا امین ہے جسے اُس نے خطرہ مول کر قبول کیا۔

اقبال انسان کے پُر امید مستقبل کا داعی ہونے کی حیثیت سے اِنسان کے عروج کے لامحدود امکانات کی بشارت دینے والے حدی خواں ہیں۔ اُنہیں انسان اور انسانیت کے دوبارہ عروج حاصل کرنے پر پختہ یقین ہے۔ چنانچہ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب وہ ارتقاء کے مراحل اور منازل کو طے کر کے اتنا بلند مقام حاصل کر لے گا کہ دُور سے گردوں کے ستارے اُسے بہ نظرِ استعجاب دیکھ کر خوف زدہ ہونگے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے — زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

اِس عظیم مقام کے حصول کے لئے قانون الٰہی کا پابند ہو کر انسان سے سعیٔ پیہم کا اقتضاء ہے۔ اقبال کے نظام فکر میں خودی کے حوالے سے عمل پیہم یا سعیٔ پیہم کا یہ پہلو، عصر حاضر تو درکنار، آنے والے ہر عصر کے انسان کے لئے گہری معنویت اور اہمیت کا حامل رہے گا۔ کیونکہ دُنیا اِنسان کے لئے امتحان گاہ کی حیثیت

رکھتی ہے جہاں اُسے اپنی خودی کو نقطۂ کمال تک پہنچا کر نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ حیات و کائنات کے تلخ حقائق کا غائر مطالعہ و مشاہدہ اور نہایت گہرا تجربہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ؎

زندگی جُہد است استحقاق نیست

کیا کسی بھی دَور میں انسانوں کا کوئی معاشرہ اس ازلی و ابدی نظریہ کو نظر انداز کر کے عروج پا سکا ہے یا عروج پا سکتا ہے؟ دیکھیں تو فکرِ اقبال کی تمامتر عمارت زندگی کے اسی اساسی اصول پر ایستادہ ہے۔ اقبال بازمانہ بسازکی بجائے بازمانہ بہ ستیز کے قائل ہیں، اور ستیز کے اندر ہی حیاتِ جاوداں مضمر ہے۔ یہاں تک کہ علامہ خضر سے بھی حرکت و عمل کے خواہاں ہیں، اور اسے سکندر کی زبانی کارزارِ حیات میں سرگرمِ عمل ہونے کی یوں دعوت دیتے ہیں ؎

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت — شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو[1]

اقبال حیات کو مسلسل عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِنسان ہمیشہ ارتقاء کے عمل میں مصروفِ کار رہے تا کہ لامتناہی حقیقت (Absolute reality) سے، جو ہر لحظہ نئی آن، نئی شان میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے، سدا تازہ انوار حاصل کرتا رہے۔ یہ مسلسل عمل ہی ہے جو اِنسان کو فاتحِ عالم بنا سکتا ہے۔ اقبال کی روحانی وجدانیات میں بھی سعیٔ پیہم اور جہد و ترقی ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس سعیٔ پیہم اور جہد و ترقی کی کوئی حد نہیں۔ ان کے امکانات کی انتہا کا قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال تلاش حق اور روحانی آسودگی کے حوالے سے اِنسانی ذہن کو برابر متاثر کرتے رہیں گے۔ اُن کا پیغام زماں و مکاں کی حدود و قیود سے بالاتر ہونے کی بنا پر آفاقی ہے۔ یہ زندگی کے بڑے طوفان کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرنے، آدمِ خاکی کو حد بندیوں سے آزاد ہونے اور اپنی ذات کی عمیق گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر تسخیر کائنات کی آرزو کے پیشِ نظر پوری دُنیا کو اپنے اندر جذب کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

اقبال جدتِ طبع کا مالک ہونے کے ناتے اپنی شاندار روایات سے کما حقہ استفادہ کرتے

---

1. How aptly did Sikandar remark to Khizar,
Participate actively in the struggle of life.
You watch the battle from the edge of the battle-field,
Die in the thick of the fight and gain everlasting life.

ہوئے سرعت کے ساتھ بدلتے وقت کے تقاضوں کو بھانپ کر ان سے ہم آہنگ ہونے اور ان کا برابر ساتھ دینے کی پُر زور تلقین کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلامی سلطنت میں اجتہاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کے لئے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمیں چاہئیے کہ آج اپنے اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی از سرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں، تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت، جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما، جو اس کا مقصود منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے''۔

بدلتے وقت کے تقاضوں سے اقبال کے ہم آہنگ ہونے کے پیش نظر اُردو کے معتبر نقاد پروفیسر آل احمد سرور مرحوم نے بجا فرمایا تھا کہ اُن کے (اقبال) خیالات کو نئے ملاّ کی پرانی داستان سمجھنے کی بجائے نئے ذہن کا معمار، اس دور کے آشوب کا محرم اور اس لئے معنویت کا حامل سمجھا جائے گا''۔ کیونکہ اُنہوں نے جمود و تعطلِ ذہنی کے دور میں جب لوگ اجتہاد کا لفظ زبان سے نکالتے ہوئے ہراساں تھے، کہ کہیں اُن پر آزاد خیالی کا لیبل نہ لگ جائے، علاّمہ نے اپنی چشم بصیرت سے آنے والے زمانے اور اس کے تقاضوں کو بھانپ لیا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وہ زمانہ جلد آرہا ہے جب مسلم ممالک طوقِ غلامی سے آزاد ہو کر اپنی اپنی حکومتیں لے کر بیٹھیں گے اور دُنیا کی دوسری مملکتوں کے ساتھ استحکام اور عروج و ترقی کے میدان میں مسابقت کرنے پر مجبور ہونگے۔ اُس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور حیرت انگیز ترقیات کے عہد میں سینکڑوں ہزاروں ایسے جدید مسائل پیدا ہونگے جن کا حل اجتہاد کے بغیر ناممکن ہوگا''۔

ایک بڑے فن کار کی شناخت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اُس کے فن کو ماضی حال اور مستقبل کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کا فکر و فن زمانوں کی تقسیم و تخصیص سے مبرّا ہے۔ ان کے یہاں ایسے ابدی حقائق اور اصولوں کی کارفرمائی ملتی ہے کہ زمانہ خواہ کتنے ہی تغیر و تبدل سے گذرتا رہے۔ ان کے افکار ہر دور میں اِنسان اور انسانیت کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ان میں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ نئے معانی پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اقبال کا ہر دور میں مطالعہ کرنے پر ایک نئے اقبال کی دید و دریافت ہوگی۔ ہر دور کا انسان ان میں صداقت کی ایک نئی خوشبو محسوس کرتا رہے گا۔ کیونکہ اقبال حیات کو ایک مسلسل عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل کم نظری ، قصۂ قدیم و جدید

اپنی وفات سے صرف تین ماہ قبل نئے سال کے پیغام میں اُنہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ اُن کی نوعِ انسانی سے اٹوٹ محبت اور سامراج سے ان کی شدید نفرت کا مظاہرہ ہے۔ اُنہوں نے فرمایا:

"وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ نوعِ انسانی کی وحدت ہے جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک اِنسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخَلقُ عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، اُس وقت تک انسان اس دُنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حُریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے"

فکرِ اقبال کی غایت فقط اقبال کے مطالعے سے یا انہیں زبانی خراج پیش کرنے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے اثباتی فکر و عمل ناگزیر ہے۔ ایک ایسا فکر و عمل، جس کے سہارے انسان عالم، انفس و آفاق کی تسخیر کر سکتا ہے۔ اقبال کی تسخیرِ انفس و آفاق کا دائرۂ اثر صرف ذات اور فرد کی اکائی تک محدود نہیں بلکہ اس کے قوسِ صعودی کی حد ملت اور اس سے آگے نوعِ انسان کے نوعی اور اجتماعی ارتقاء کے بعید ترین گوشوں سے جا ملتی ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اقبال ایک آفاقی شاعر کی حیثیت سے

عصرِ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کا دور ہے، چنانچہ قارئین اقبال کے ذہنوں میں رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں اقبال کے فکر کی اہمیت اور افادیت کیا ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی زندگی میں آرام و آسائش بہم پہنچانے میں سائنسی اختراعات و ایجادات کا غیر معمولی کردار ہے لیکن حیاتِ انسانی کی تکمیل صرف جسمانی آرام و آسائش سے ممکن نہیں کیونکہ انسان جسم اور روح دو عناصر کا مرکب یا مجموعہ ہے۔ چنانچہ جسمانی اعتبار سے راحت و فرحت کے پہلو بہ پہلو اُسے روحانی آسودگی کی بھی اشد ضرورت ہے لیکن بدقسمتی سے انسانی زندگی کے مادّی پہلو پر تمامتر توجہ مرکوز کر کے اس کے دوسرے پہلو یعنی روح کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں انسان باطنی طور پر کشمکش، ہیجان اور تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے نہایت مضرت رساں اثرات نہ صرف فرد واحد کی زندگی پر بلکہ پورے معاشرے اور پھر پوری انسانیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ ادب کو زندگی کا آئینہ یا ترجمان کہا گیا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کو موضوع بنا کر مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر کے ان کا عکس اُتارا جاتا ہے۔ اور پھر جب اقبال جیسے شاعر کی بات ہو، جو ادب سے زندگی کی بہتر تعمیر و تشکیل کا فریضہ انجام دینے کے قائل ہیں۔ تو مذکورہ بالا کتابیہ کو اور بھی استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کا شاعرِ اسلام ہونا جہاں اُن کی آفاقیت کی دلیل ہے، وہیں کوتاہ اندیشوں نے اس سے اُن کے فقط ایک فرقے یعنی مسلمانوں کا شاعر ہونے اور ان کے فکر کے دائرۂ اثر کو محدود کر دیا ہے۔ اسلام یا مسلمان کی اصطلاح اپنے اندر بے پناہ وسعت اور تنوع لئے ہوئے ہے۔ یہ تمامتر امتیازات سے بالاتر ہو کر بنی نوعِ انسان کی اہمیت کی قائل ہے۔ علامہ کی تمامتر طلب و جستجو اور قوت ایک صالح معاشرہ کی تعمیر و تشکیل پر مرکوز رہی ہے۔ اُن کی شاعری اور فکر کا مقصد و منتہا اسلام کی وکالت ہرگز نہیں بلکہ اُنہوں نے اپنے نظامِ فکر کی ترجمانی کیلئے اسلام کو یقیناً ایک وسیلہ یا آلۂ کار بنایا کیونکہ یہی وہ دین ہے جو آفاقی اقدار کی پاسبانی اور پاسداری کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی کی عطا کے نتیجے میں علامہ کا فکر اور جذبہ علاقائیت، رنگ و نسل، اور زبان وغیرہ کو

پھلانگ کر پورے نوعِ انسانی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ درد و سوزِ آرزومندی کو متاعِ بے بہا تصور کرتے ہیں جو بندگی ہی کی بدولت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ مقامِ بندگی کے مقابلے میں شانِ خداوندی تک کو قبول کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہوتے۔ مقام آدمیت، احترام آدمی اور عظمت آدم کا درس اُس دانائے راز نے قرآن مقدس سے سیکھا ہے۔ یہی صحیفۂ کائنات اُن کی فکر کی اساس ہے کیونکہ اس صحیفۂ کائنات کا موضوع حضرت انسان ہے۔ انسان کی نفسیات، اُس کے کوائف، اس کی نیکیوں، اُس کی بغاوتوں، اس کی مجبوریوں، اس کی فضیلتوں، قوموں کی اجتماعی خصلتوں اور عادتوں، امم سابقہ کے تجربوں اور امم آئندہ کے لئے بصیرتوں کے علم کے اعتبار سے یہ کتاب مقدس انسان اور انسانی امور ہی کی سرگزشت ہے۔ خود علامہ کے بقول اُن کے اجداد کی عمریں خدا کی تلاش میں بسر ہوئیں لیکن علامہ کی عمر اس کے برعکس انسان کی تلاش میں گزرتی رہی، انسان کے اس سراپا دردمند مفکر شاعر کی ہمدرد آنکھ ان گنت شبوں کی تاریکیوں میں زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی کی خاطر اشکبار ہوئی ہے۔

اقبال کو ایک عظیم سائیکوتھیراپسٹ (psychotherapist) کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ فطرتِ انسانی کے متعدد اور مختلف پہلوؤں اور کیفیات پر غور و فکر کرتے ہوئے موجودہ دور میں دُکھتی انسانیت کے رستے زخموں پر مرہم رکھنے اور اُنہیں مندمل کرنے کی غرض سے اُنہوں نے ایک دردمند، پرسوز اور دلگداز شاعر و مفکر کی حیثیت سے مسائل کا حل تلاش کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ خودی اُن کے نظامِ فکر کا مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد اُن کے تمام افکار گردش کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی فکر کا بنیادی مقصد انسان کی ذات میں خام حالت میں موجود بے انتہا استعداد اور صلاحیت کی شناخت کر کے اُسے ارتقاء تک پہنچا کر اور فطرت پر تسخیر پا کر اس زمین پر خدا کا نائب بن جانا ہے۔ اقبال کا دیا ہوا یہ پیغام رنگ و نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر پورے نوع انسان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر مرا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند

احترامِ آدمیت اور عشق وہ دو ستون ہیں جن پر اقبال کی آفاقیت کا انحصار ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے مخاطب نہ صرف ایشیائی اقوام ہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان بھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر وہ اُنہیں اسی مقام پر فائز کرنے کے نسخے بھی بتاتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ نیابت الٰہی کے عظیم مقام پر پہنچ سکتے ہیں تاہم اُمت مسلمہ سے خطاب کے علاوہ وہ بنی نوع انسان سے بھی مخاطب ہیں۔ اس میں ملک، رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ؎

من اول آدم بے رنگ و بویم — ازاں پس ہندی و تورانیم من

انسان کے دُکھ درد کو ایک دردمند اور پُرسوز دل رکھنے والے مفکر شاعر کی حیثیت سے وہ نہ صرف اِسے محسوس کرتے ہیں بلکہ اس میں تخفیف کرنے اور اس کا سدِ باب کرنے کے نسخے بھی بتا دیتے ہیں۔ نوعِ انسان کو حرص و ہوس کے ہاتھوں پارہ پارہ دیکھتے ہوئے وہ انسان کو اخوت کا بیان اور محبت کی زبان ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ آدمیت یا انسانیت ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اُسے کائنات کی دیگر مخلوقات پر فضیلت عطا کرتی ہے۔ احترامِ آدمیت کی ہی بدولت انسان اس کرۂ ارض پر انسان کی طرح زندہ رہ سکتا ہے ورنہ یہ دنیا جنگلی جانوروں کے شکار کے لئے پیکار کی آماجگاہ سے کچھ کم نہ ہوگی۔ آدم کا مقام گردوں سے بھی برتر ہے اور تہذیب کا دارومدار احترامِ آدمیت پر ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان اپنے وجود کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ساری کائنات اُس کے تابع ہے۔ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا کر وہ زندگی کے راستے میں آنے والی تمام تر رکاوٹوں کو دور کر کے اپنے وجود کی صلابت اور قوت کو ثابت کرنے کی اہلیت سے بہرہ مند ہے۔

اس ذرّے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرّہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی — یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

مغرب اور مغربی تہذیب کے تئیں اقبال کا رویہ انتہائی متوازن ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کی بدولت وہ جہاں اُسے داد و تحسین سے نوازتے ہیں وہیں اس تہذیب کے مادّیت کے غلبے، معاشی اور سیاسی نظام کے روحانیت سے عاری ہونے کی بناء پر اسے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مغرب کی مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو وہ اس کی روحانی اور اخلاقی ترقی کو بھی ناگزیر قرار دیتے ہیں، تاہم یہ خصوصیت اُنہیں مشرق اور مغرب دونوں میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ دونوں میں رواج پا گئی خامیوں کا مشاہدہ اور احساس کرتے ہوئے علامہ انہیں نہایت جرأت اور بے باکانہ انداز میں دعوتِ مبارزت دیتے ہیں۔ وہ دونوں کے حق میں دلّی آرزو رکھتے ہیں کہ دونوں خدا اور اس کی فعال تخلیقیت کو اختیار کر کے اس کا اتباع کریں۔ اس جہاں میں ہنوز رائج متضاد اور متصادم نظریات نسلی امتیازات اور مختلف طرح کے تعصبات نوعِ انسان کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔ حقیر مقامی اور متعصبانہ خیالات عظیم مقام کے حامل انسان کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔ حقیقت کے تئیں مشرق کی کورنگاہی کے اسباب تقلید کورانہ اور غلامی ہیں۔ اقبال کے یہاں مشرق اور مغرب دونوں اپنی اپنی خامیوں کے باعث تنقید کا نشانہ بن چکے ہیں ؎

نہ ایشیا میں، نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات — خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت

اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے مثبت پہلوؤں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

آدمیت کے پیمانے اُن کے یہاں محدود نہ ہو کر آفاقیت یا عالمگیریت کے حامل ہیں۔ وہ مسلمانوں کی نژادِ نو سے بلا امتیاز ذات پات، اور رنگ و نسل انسان کا احترام کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ''شیخ و برہمن'' عنوان کے تحت اپنی ایک نظم میں ایک کافر نوجوان سے اپنے طرزِ حیات پر مستحکم رہ کر اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کی تاکید کرتے ہیں۔ فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں اقبال وشوامتر (جہاں دوست)، بھرتری ہری، زرتشت اور گوتم بدھ کی حکمت کی داد دیتے ہیں۔ اُن کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے برے اعمال اور اُن کی خامیوں کی نشاندہی پر مشتمل ہے۔

دوسرا ستون جس پر اقبال کی آفاقیت کا دارومدار ہے عشق ہے۔ عشق مذہب کی اساس ہے۔ دین اسلام کی صحیح تفہیم اور اپنے افکار و خیالات کو اسی کے مطابق ڈھالنا اقبال کی خوبی ہے۔ وہ مذہب کو عام، رسمی یا ظاہری معنوں میں نہ لیتے ہوئے اس کی اصل اور حقیقی روح کو سمجھتے ہوئے اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں۔ مذہب کے لئے علامہ Higher Religion کے الفاظ برتتے ہیں۔ اس طرح مذہب کو اپنی ارتقائی اور اعلیٰ شکل و صورت میں سمجھ کر اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں ''ہائر ریلجن'' کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہے۔ اُن کے مرشد کامل نے اُن پر یہ بھید آشکار کیا ہے ؎

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقلِ کل شدۂ، بے جنون مباش

اقبال کے یہاں Higher Religion ظاہر پرستی اور رسوم کی انجام دہی جیسے عوامل سے بالکل بالاتر ہے۔ مذہب سے وہ عشق حقیقی مراد لیتے ہیں۔ Higher Religion کا مقصد انسان کی قلب ماہیت کر کے اُس کے خارج و باطن کی صحیح رہنمائی کرنے کا نام ہے۔ انسان کی شخصیت اور اس کا کردار مذہب سے تشکیل پا کر پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے کیونکہ مذہب نہ صرف فردِ واحد کے ارتقاء تک محدود ہے بلکہ یہ فرد سے سماج یا معاشرے کی طرف بڑھتا ہے اور نوعِ انسان کے لئے امن و آشتی کا پیغام لاتا ہے۔ چنانچہ اپنی فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں پیر رومی کی زبانی دین کو تہذیب کی بنیاد قرار دیتے ہوئے دین کو عشق کی وسیع اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں ؎

زندگی را شرع و آئین است عشق اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق

اقبال دینی مباحثوں، مناظروں اور بغیر عمل کے عبادت کے مقابلے میں عشق خداوندی کی اہمیت کے قائل ہیں۔

فکر اقبال میں دل یا قلب کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اسے (یعنی دل کو) ایک بڑے مخزن سے تعبیر کرتے ہوئے کہیں عرش اور کہیں کعبہ جیسا اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا گیا ہے۔ دل خدا کا مسکن ہے جسے اقبال کے نزدیک غالباً جبرئیل امین کے پاس بھی گرو نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک مقام پر خدا سے نہایت

استعجاب کے ساتھ استفسار کیا گیا ہے کہ اے خدا آشیانۂ قلب کس کا مقام و مسکن ہے۔ دل کو دامِ عشق میں پھنس کر ہی رہائی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور یہی اس کے آزاد ہونے کی سند ہے۔

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے　　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اقبال کی آفاقیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اُن کی شاعری اور فکر کا سورج آج بھی درخشاں ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ دنیا کی مختلف ترقی یافتہ زبانوں میں نہ صرف اُن کے کلام کے ترجمے ہو چکے ہیں بلکہ اُن پر خاصا وقیع کام بھی ہو چکا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا ہے کیونکہ اُن کا فکر غیر معمولی وسعت اور تنوع کا حامل ہے جو نوعِ انسان کو ہر دور میں فیضان پہنچاتا رہے گا۔

فکرِ اقبال کی انفرادیت کی ترجمان مثنوی اسرارِ خودی

اقبال کے اسلاف کی زندگیاں جہاں خدا کی تلاش میں صرف ہوئیں وہاں اقبال کو زندگی بھر انسان کی تلاش رہی۔ اُن کی پہلی فارسی مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی، جس کے غائر مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ایک مجتہد فلسفی شاعر کی حیثیت سے کیا ہے، جو برابر اُن کی آخری تصنیف ارمغان حجاز تک جاری رہا۔ اسرار خودی کی تخلیق جس وسیع منظر نامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے علامہ نے کی ہے، اسے سمجھے بغیر اقبال کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اقبال کی نگاہوں کے سامنے وہ عالمی صورت حال رہی ہے جس نے بڑی حد تک امتِ مسلمہ پر اپنے گہرے اثرات ثبت کئے اور جس کے نتیجے میں مسلمان زوال پذیر ہوتے رہے۔ گرچہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کے بہت سارے اسباب ہیں، جن میں غیر اسلامی تصوف کے عناصر بھی شامل ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کو حرکت و فعال بنانے کی بجائے اُنہیں بے عمل بنا دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اقبال وہ پہلے شاعر نہیں جنہیں امت مسلمہ کی زبوں حالی کے غم نے راتوں کو رُلایا، اُن سے پہلے اُن کے بزرگ ملّی شاعر خواجہ الطاف حسین حالؔی اس حوالے سے اپنا مسدس مدوجزر اسلام تخلیق کر چکے تھے، اور مسلمانوں کے شاندار ماضی اور پھر ان کے زوال کو پُر درد پیرائے میں موضوع بنا چکے تھے، اب اقبال کے سامنے اہم کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے دوبارہ اُبھرنے اور ان کے احیائے نو کا راستہ بتا دیتے۔ یہ کام کوئی آسان کام نہ تھا۔ اقبال نے اس کا بیڑا اٹھایا اور امت مسلمہ کے احیائے نو کو اپنا مقصد بنایا۔ یہ فہم کی کوتاہی ہے کہ اقبال جب اُمت مسلمہ کی بات کرتے ہیں تو انہیں اکثر مسلمانوں تک محدود کر کے اُن کے فکر کی وسعتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ اور اسے درپیش مسائل کی ترجمانی سے اقبال کا مقصود اسلام کی وکالت ہے اور نہ ہی کسی مخصوص گروہ یا دنیا کی کسی جماعت پر اُسے فضیلت عطا کرنا ہے بلکہ جو چیز تمام نوع انسانی کو وحدت کے رشتے میں پرونے کا کام بخوبی انجام دے سکتی ہے، خیر پر مبنی ایک صالح عالمی معاشرے کو جنم دے سکتی ہے، انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا سکتی ہے، اُسے اپنا جائز مقام عطا کر سکتی ہے۔ ان تمام امور کی انجام

وہی اگر اسلام یا اسلامی تعلیمات سے ممکن ہو سکتی ہے تو اس میں عصبیت کی کیا بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے انسانی حیات کے تمام تر مسائل کا علاج اس میں پا کر اس سے اپنے فکر کا تار و پود تیار کیا۔ اُمت مسلمہ چونکہ تمام امتوں میں امتِ خیر کا اعزاز رکھتی ہے، اسی لئے اقبال اقوام عالم کی قیادت یا ساقی گری کی خدمت کی انجام دہی اسی امت پر عائد ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اسلام سے برگشتگی کے نتیجے میں مسلمانوں کے انحطاط کے پیش نظر اقبال انہیں دوبارہ اسلام کی طرف مراجعت کرنے کی رہ رہ کر تلقین کرتے ہیں تا کہ ان کا احیائے نو ہو۔ مثنوی ''اسرار خودی'' فرد کی خودی سے متعلق ہے، یعنی فرد کس طرح خدا کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو قانونِ الٰہی کے تابع کر کے اپنی خودی کو مختلف مراحل سے گزار کر اسے مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ مثنوی میں امتِ مسلمہ کے زوال کے مختلف اسباب پر غور و فکر کرتے ہوئے غیر اسلامی تصوف کے عناصر کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسی شاعری، جو انسان کو تحرک اور فعالیت کی ترغیب نہ دے، بھی مسلمانوں میں بے عملی اور انجماد پیدا کر دیتی ہے۔ اس حوالے سے اقبال نے یونانی فکر اور فارسی کے ممتاز شاعر اور لسان الغیب خواجہ حافظ[1] شیرازی کی شاعری سے برآمد ہونے والے اثرات کو بھی مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں قرار دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ جس پر حلقۂ صوفیاء میں ایک ہنگامہ برپا ہوا اور اقبال کے بزرگ دوست اور اُردو کے بڑے شاعر اکبر الہ آبادی اور خود اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد نے اقبال کو مثنوی ''اسرار خودی'' سے قابل اعتراض حصہ خارج کر دینے کی ہدایت کی جس پر بعد میں اقبال عمل پیرا بھی ہوئے۔ اقبال نے بڑے ہی چاؤ اور غور و فکر کے بعد یہ مثنوی لکھی تھی لیکن ابتداء میں معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہوا لیکن اقبال کا مخلصانہ جذبہ اور ان کی محنت شاقہ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ چنانچہ مغرب نے اس مثنوی کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر اور انگریز مستشرق رینالڈ اے نکلسن اقبال کی اس مثنوی سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور اُنہوں نے اس کے مصنف سے اس کا ترجمہ کرنے کی اجازت طلب کی جو انہیں مل گئی۔ نکلسن کا انگریزی ترجمہ "Secrets of Self" کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ مترجم نے ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی تحریر کیا جو بڑا ہی فکر انگیز ہے اور فکر اقبال سے مطابقت رکھتا ہے۔ نکلسن کے ترجمے اور مقدمے کی بدولت اقبال انگریزی دان طبقے میں پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر متعارف ہوئے اور اقبال کی فکر

۱۔ اقبال نے ان کی نسبت یہ بھی کہا ہے کہ بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔

پر بحث و تمحیص کے دروازے وا ہوئے۔ کیمبرج ہی کے ایک اُستاد ڈکنسن اور ایک اور تنقید نگار ای۔ ایم۔ فارسٹر، دونوں نے ترجمے کی وساطت سے اقبال کی مثنوی پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اول الذکر کا مضمون انگلستان کے ایک ادبی رسالے "اتھینیم" (Athenaeum) میں اور ثانی الذکر کا مضمون تبصرے کی شکل میں ہفتہ وار "Nation" میں شائع ہوا۔ ای۔ ایم۔ فارسٹر کے خیالات کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے مثنوی کا مطالعہ دقتِ نظر سے نہ کرتے ہوئے سطحیت سے کام لیا ہے جس کے نتیجے میں وہ اقبال کو اپنے صحیح تناظر میں سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اقبال کے Superman (مردِ مومن، یا مردِ کامل) کو جرمن مفکر فیڈرک نطشے سے مستعار قرار دیتے ہیں۔ اُن کی سخت کوشی کی تعلیم کو بھی اسی مفکر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اقبال نے فوق الانسان کو قرآن سے ملا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خیال کی پیروی یا ہمنوائی بعد کے اکثر اقبال شناسوں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (فکر اقبال کے مصنف) بھی شامل ہیں۔ لیکن اقبال مردِ کامل کے موضوع پر سالہا سال پہلے سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اور دونوں کے مردِ کامل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اقبال روحانیت کے قائل ہیں جبکہ نطشے خالص مادیت کے۔ جیسا کہ اقبال لکھتے ہیں:

> "The concept of superman in Nietzsche is purely materialistic... I wrote on the subject (انسان کامل) about 36 years ago immediately after leaving the college. My dissertation was published in the "Antiquary" of Bombay and now forms part of my 'development of metaphysics in Persia... Nietzseche's superman is a biological product. The Islamic perfect man is the product of moral and spiritual forces."[1]

نطشے اور اقبال دونوں تھوڑی دیر تک ساتھ چل پڑتے معلوم ہوتے ہیں لیکن تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جداگانہ منزلوں کی اور بڑھتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کے اُس بیان کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس کی رُو سے وہ کہتے ہیں کہ وہ مردِ کامل کی نسبت اس زمانے سے اس نوع کے خیالات ظاہر کر رہے ہیں جب نطشے کی بھنک تک ان کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ دراصل

---

1. Discourses of Iqbal, (Compiled and Edited by Shahid Hussain Razzaqi.1979). p. 200-201

اقبال کے مردِ کامل کو نطشے کے superman کی بجائے عبدالکریم الجیلی کے ''الانسان کامل'' کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مثنوی ''اسرار خودی'' کو اپنے حقیقی معنوں میں نہ سمجھتے ہوئے اقبال سے طرح طرح کے خیالات منسوب کر کے اُن پر اعتراضات کیے گئے جن کا استرداد کرتے ہوئے اقبال نے اپنے موقف کی وضاحت مثنوی کے ترجمہ کار پروفیسر نکلسن کے نام ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو تحریر کیے گئے خط میں کی۔ مثلاً ڈکنسن نے مثنوی کا مطالعہ اسلامی نقطۂ نظر سے کرنے کی بجائے سیاسی نقطۂ نظر سے کیا تھا۔ اسی لئے انہیں اقبال کا فلسفۂ قوت اخلاقی سے زیادہ سیاسی مفہوم کا حامل نظر آیا۔ اُن کے خیال میں اقبال کا فلسفہ اگرچہ بظاہر عام ہے تاہم عملی طور پر انہوں نے اسے ایک گروہ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ اُن کے نزدیک اقبال کی نظر میں فقط مسلمان تاج و تخت کے وارث ہو سکتے ہیں باقی دنیا کو یا تو ان میں جذب ہو جانا چاہیے یا فنا ہو جانا چاہیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے کہا کہ مسلمانوں کے علاوہ کافۂ انام یعنی خدا کی جمعیت اسلامی عقیدے کی رُو سے آسمانی بادشاہت میں داخل ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نسل و قوم کے تمام اصنام کو توڑ دیا جائے اور ایک دوسرے کی انا یا خودی کو تسلیم کیا جائے۔

اقبال اپنے عہد کی عالمگیر ابتر صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اسلام کی رُو سے جوع الارض کیلئے لڑی جانیوالی ہر جنگ کو حرام قرار دیتے ہوئے صرف جہاد فی سبیل اللہ کو جائز مانتے ہیں۔ ڈکنسن بھی جنگ کو موجب فساد سمجھتے ہوئے اسے مذہب کی ضد سمجھتا ہے۔ انہوں نے اقبال پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انہوں نے مادی قوت کو معبودیت کا درجہ دیا ہے لیکن اقبال نے نکلسن کے نام تحریر کردہ متذکرہ خط میں ڈکنسن کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ جسمانی قوت کے نہیں روحانی قوت کے قائل ہیں۔ اسلام نے جوع الارض یا تسخیر ممالک کیلئے لڑی جانیوالی ہر جنگ کی حرمت کر کے صرف جہاد فی سبیل اللہ کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اقبال بھی اسی اسلامی تعلیم کی رُو سے غیر اللہ کیلئے بلند ہونے والی ہر تیغ کی حرمت کرتے ہوئے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کیلئے ہر تیغ کو نیام سے باہر کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔

صلح شر گردد چو مقصود است غیر — گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند — جنگ باشد قوم را ننگ و گزند
دیدہ بر خوانِ اجانب دوخت است — آتش جوعش جہانے سوخت است
از خیالِ خود فریب و فکر خام — می کند تاراج را تسخیر نام
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید — تیغِ او در سینۂ اُو آرمید

اقبال نے ایک دانشور، فلسفی شاعر، نوعِ انسانی کے ہمدرد اور اسلام کے داعی کی حیثیت سے پہلی جنگِ عظیم

(۱۹۱۴ء) کے نتیجے میں وقوع پذیر تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے دنیا کو محفوظ رکھنے کی خاطر انسدادِ جنگ کے ممکنہ اقدامات پر عمیق غور وفکر کرتے ہوئے فطرت انسانی اور اُس کی نفسیات کے پیش نظر یہ احساس دلایا کہ انسان کے اندر کی قوتِ استیلا کے نتیجے میں وقوع پذیر غیر اخلاقی کشمکش کو روکنا کوئی سہل کام نہیں۔ یہ مشکل کام سراپا خیر اور ہمہ جہت روحانی مقاصد پر نظر رکھنے والی ایک زندہ شخصیت ہی انجام دے سکتی ہے۔ اس زندہ شخصیت کی تعلیم سے انسان کے اندر کی جارحانہ قوتیں کُند ہو جاتی ہیں اور جارحیت کی صلاحیت موزون تربیت سے بدی کی مزاحمت اور خیر کیلئے پیش قدمی کی قوت بن جاتی ہے۔ لہٰذا انسانی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہوئے علامہ نے جوع الارض میں مبتلا اقوام کو جنگ سے روکنا ناممکن قرار دیا ہے۔ انہوں نے جنگ کو جوع الارض کی بجائے روحانی مقاصد سے وابستہ کر کے اس کی تطہیر وتقدیس پر زور دیا ہے۔ جنگ کو جوع الارض تک محدود رکھ کر اس سے تخریب انسانی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جنگ سے پیدا ہونے والی تخریب سے کون واقف نہیں، ڈکنسن بھی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ نوعِ انسانی کو اس تخریب سے نجات دلانے کی خاطر جنگ کو مطلقاً روک دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ انسانی نفسیات سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ معاہدے، صلح نامے اور انسداد جنگ کی مختلف تجویزیں استیصال حرب نہیں کر سکی ہیں اور جنگیں مختلف شکلوں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے انسانی فطرت کے تقاضے کے تحت جنگوں کے مقصد کی تطہیر وتقدیس کی تجویز پیش کی ہے۔ ان کے نزدیک جنگ کو فطری امر ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ اخلاقی اور روحانی اصولوں کے تابع کر دینا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے حکماء جنگ کی مخالفت کرتے ہوئے اسے روک دینے کے حق میں ہیں لیکن بغور دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ گفتار کے ان غازیوں کے نظریات اور فلسفے انسان کے اندر چھپی ہوئی مادّی اور حیوانی قوتوں کو تقویت دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ اور بالآخر یہی فلسفے اور نظریات ایک نئی جنگ کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ ان حکماء کی دوہری پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اگرچہ بظاہر جنگ کو روک دینے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو قوت سے معمور اقوام، کمزور اقوام کو جھانسا دے کر مختلف حربے اپنا کر انہیں مغلوب کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم، عالمی سطح پر اپنے جلو میں ہولناک تباہی لے آئی۔ اس کے بعد ایک بار پھر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم لڑی گئی جس نے انسانیت کے ساتھ وہ کھیل کھیلا جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان دو عالمگیر جنگوں کے نتیجے میں دنیا کے باشعور اور اہل فکر طبقے کو گہری تشویش لاحق ہوئی اور وہ انسداد جنگ کیلئے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ سیاسیات کے عالم اور ماہر رابرٹ گنز برگ

نے ۱۹۶۹ء میں چالیس ملکوں کے سیاست وفلسفہ کے ماہرین سے ۱۹۲ مقالات تحریر کرائے، جن میں سے ۱۸ مقالات کو منتخب کر کے "The Critique of War" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے کر شائع کی گئی۔ کتاب میں جنگ اور امن کے حوالے سے ماہرین کے خیالات درج ہیں۔ کتاب کا مقدمہ رابرٹ گنز برگ نے تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے جنگ کو انسان کے اولین دشمن سے تعبیر کرتے ہوئے اس بات پر گہرے تاسف کا اظہار کیا ہے کہ انسان کے اس اولین دشمن کے سرپرست انسان ہی ہیں۔ سائنس، جو دنیا کو جنت بنا دینے کے دعاوی سے ابھری تھی، کو انسان کش عوامل کا آلۂ کار بنا دیا جاتا ہے جس کی بدولت نوع انسانی کی تباہی و بربادی کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے۔ رابرٹ گنز برگ کے نزدیک اس آفت کو روکنے کا کام فلسفی کر سکتے ہیں لیکن وہ مایوسی کا شکار ہو کر اس کام سے دامن کش ہو چکے ہیں۔ تاہم اس نہایت سنجیدہ مسئلہ کے تئیں اقبال کی گہری اور سنجیدہ وابستگی رہی ہے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کی رُو سے جوع الارض کیلئے لڑی جانے والی تمام جنگوں کی حرمت کر کے صرف جہاد فی سبیل اللہ کی پرزور تلقین کی ہے۔ اقبال مفکر کا دماغ اور شاعر کا دل لے کر آئے تھے جنہوں نے جنگوں کو اخلاقی اور روحانی مقاصد سے وابستہ کر کے ان کی تطہیر و تقدیس کا نظریہ پیش کیا۔

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید

خودی کو اپنے فکر کا محور و مرکز بنانے کی بناء پر اقبال کو بجا طور پر خودی کے پیامبر کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ اس اصطلاح کے ابتدائی نقوش اُن کی بیاض "Stray Reflections"[1] میں ملتے ہیں۔ اِس ڈائری میں اقبال نے خودی کی بجائے شخصیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ۱۹۱۵ء تک آتے آتے علاّمہ نے ''اسرارِ خودی'' اور ۱۹۱۸ء میں ''رموزِ بے خودی'' میں فلسفۂ خودی کو مربوط شکل میں پیش کیا۔ علاّمہ اِس مثنوی کا تیسرا حصّہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر وہ اِسے عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ اسرار و رموز کے بعد اقبال کی تصانیف خواہ وہ منظوم ہوں، خواہ منثور، میں اُن کے افکار و خیالات کا محور زیادہ تر یہی فلسفۂ خودی رہا۔ اِن میں علاّمہ اِسی موضوع کو سو رنگ سے باندھتے رہے اور اسے خاصی وسعت اور تنوع عطا کرتے رہے۔ خودی سے اقبال معرفت نفس یا عرفان ذات مراد لیتے ہیں۔ یہی وہ اکائی ہے جسے انسانی زندگی کے نظام کی اساس اور مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ خودی کے موضوع کو اقبال نے پہلی مرتبہ نہیں برتا۔ اُن سے پیشتر بھی فارسی کے صوفی شاعروں نے اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان شعراء اور دیگر مکاتبِ فکر نے اِنسانی خودی کو حقیر قرار دیتے ہوئے اِسے محض واہمہ یا فریب سے تعبیر کیا ہے۔ وحدت الوجود اور عجمی تصوف میں اسے شعورِ ابدی یا شعورِ مطلق کے اُس منقطع جزو سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس میں اپنے ادغام کے لئے سعیِ پیہم میں مصروفِ عمل ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدہ پر یقین رکھنے والوں کا یہ ماننا ہے کہ انسان کا اعلیٰ ترین مقصد اپنی خودی کو شعورِ مطلق میں اُسی طرح مدغم کرنا ہے جس طرح قطرہ سمندر میں مل کر اپنے وجود کو فنا کر دیتا ہے۔ لیکن اقبال اِس عقیدہ کی یکسر مخالفت کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اِس سے اختلاف کرتے ہیں بلکہ اِسے سماجی اور سیاسی اطلاقات میں بھی خطرناک تصور کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسان کا مذہبی یا اخلاقی نصب العین یہ نہیں کہ وہ اپنی انفرادیت کو ذاتِ مطلق میں مدغم کرے بلکہ اقبال اِنسان کی خودی کو بیش بہا قرار دیتے ہوئے اِسے استحکام بخشنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نفسِ انسانی کسی معمولی مابعد

۱۔ علاّمہ کی یہ ڈائری اُن کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے ترتیب دے کر شائع کرائی ہے۔

الطبعیاتی تصور کا نام نہیں۔ یہ وہ اہم سرِ زندگانی ہے جسے اُس پر اس لئے آشکار کیا جا چکا ہے تا کہ درد و کرب میں گھری دُنیا اپنے اندر ایک انقلاب بپا کر سکے۔ چنانچہ علاّمہ ایک پیغام رساں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ دُنیا کو اس سے فیض یابی کی دعوت دیتے ہیں۔ خودی کیا ہے؟ خود اقبال کے نزدیک، میں ایک نا تراشیدہ کھردرا بت تھا۔ بدزیب' بے ڈول' بے مول' غرض کسی کام کا نہ تھا۔ محبت نے مجھے تراشا اور مجھے انسان کا روپ بخشا۔ اسطرح مجھے کائنات کی ماہئیت کا علم حاصل ہوا۔

علاّمہ نے خودی کی تربیت کے تین مراحل' اطاعت' ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کی تشریح کرنے کے بعد خودی کو مستحکم کرنے اور اسے ضعف پہنچانے والے عناصر کی وضاحت کی ہے۔ فلسفۂ خودی کی تشریح کے سلسلے میں اقبال نے اپنے مُرشد معنوی مولانا رومی اور جرمن حکیم فیڈرک نطشے کے افکار سے جزوی طور پر استفادہ کر کے اس موضوع پر اپنی انفرادیت کی گہری چھاپ چھوڑ دی ہے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ خودی کے تئیں جرمن حکیم نطشے کا رویہ علامہ کے رویئے سے اساسی طور پر نہ صرف مختلف اور منفرد ہے بلکہ جُداگانہ بھی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ نطشے آرزو کی اہمیت منوا کر اسے کامیابی و کامرانی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ Mercy out of reason is a coldness of blood ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا یہ کہنا بھی دُرست ہے کہ:

''اسرارِ خودی لکھنے کے زمانے میں اقبال نطشے کے افکار کے ایک پہلو کا مدّاح تھا۔ ضعف پسندی اور نفی خودی کا اقبال بھی مخالف تھا اور نطشے بھی۔ تہذیب فرنگی کا نطشے بھی ایسا ہی مخالف تھا جیسا کہ اقبال۔ انحطاط اور پستی اور ضعف خودی کے متعلق اقبال اور نطشے کی زبان بہت ملتی جلتی ہے اور اسرار خودی میں بعض افکار اور بعض مثالیں نطشے سے ماخوذ ہیں۔ لیکن دوسرے لحاظ سے اقبال اور نطشے میں بعدالمشرقین ہے۔ دونوں میں افکار کے ایک پہلو کی ظاہری مناسبت ہے''[1]

تاہم اقبال اور نطشے میں ظاہری مماثلت کے باوجود بنیادی فرق ہے۔ علاّمہ خدا کی ذات پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انسان کی خودی کو قانون قدرت کے تابع رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ علاّمہ مذہب اور اخلاق کے کڑے پاسدار ہیں۔ اِس کے برخلاف نطشے خدا کے مر چکنے کا اعلان کرتا ہے۔ اور مذہب اور

۱۔ ۱ فکرِ اقبال

اخلاق کو اِنسان کی کمزوری سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اقبال کے یہاں دلبری ہے۔ نطشے کے یہاں قاہری ہے۔ جہاں تک مولانا رومؔی کے مُرشد روحانی ہونے کا تعلق ہے، علاّمہ نے اسرارِ خودی میں مولانا رومؔی کی ایک غزل کے تین اشعار کو مذکورہ کتاب کا فاتحۃ الکتاب بنایا۔ مولانا رومی اور اقبال دونوں کو انسانِ کامل کی تلاش ہے۔ مولانا رومؔی کی مثنوی (جسے 'ہست قرآن در زبان پہلوی' کی حیثیت حاصل ہے) میں خودی کی نسبت اشعار ملتے ہیں۔ اقبال نے بلاشبہ مثنوی شریف سے استفادہ کیا ہے، لیکن خودی خودی کی تربیت، ونشو ونما، اس کے ارتقاء اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج رومؔی اور اقبال دونوں کے یہاں دو جُدا جُدا سمتوں میں آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ مثنوی کے اختتام پر مولانا رومی تین طرح کے انسانوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) دانا لوگ (جن کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ جن کے پاس اپنی روشنی ہوتی ہے)۔
(۲) نصف دانا لوگ (ایسے لوگ دانا لوگوں سے اخذ واکتساب کرتے ہیں)۔
(۳) احمق لوگ (یہ لوگ کسی سے نہیں سیکھتے)۔

رومؔی کے بہت بعد میں مشہور صوفی شاعر مولانا عبدالرحمان جامؔی اپنی تصنیف ''لوائح'' میں تصفیۂ قلب، تزکیۂ نفس، یعنی روح کو آلودگی سے پاک وصاف کرنے، آنسوؤں اور آہوں کو روز کا معمول بنانے، خود سے بیگانہ کرنے اور راہِ حق کی جانب رہنمائی کرنے اور خود کو گم کر کے خدا سے لو لگانے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ نفسِ انسانی کی نسبت صوفیوں کے اس رویئے کے برعکس علاّمہ نے نفس کی ماہیت اور اہمیت کا احساس دلایا۔

اِنسان بظاہر آب وخاک کے سِوا کچھ بھی نظر نہیں آتا، مگر قرآن کی رُو سے دیکھیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس میں اپنی رُوح میں سے حصہ عطا کیا ہے، اِس لئے اُسے اس کرۂ ارض پر نیابتِ الٰہی کا فرض انجام دینے کی غرض سے خلق کیا گیا ہے۔ اُسے نہ صرف اپنے نفس پر قابو پانا ہے بلکہ اس پوری کائنات کو مسخر کرنا ہے۔ وہ قانون قدرت کی پیروی کر کے اپنے عمل کی بدولت اُن بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قانونِ الٰہی سے انحراف کر کے وہ اپنے منفی اور تخریبی عمل کے نتیجے میں نیابت الٰہی کے اعلیٰ مقام سے محروم رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال دین اسلام کے حوالے سے انسان کی غیر معمولی قوتوں کے عمل کے لئے حدود کے تعین کی بات کرتے ہیں۔ جس اِنسان کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے، وہ مسلمان ہو جاتی ہے۔ علاّمہ کے نزدیک مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا۔ جب کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو برقرار رکھا۔ کہنے کا مقصد یہ

ہے کہ علامہ اِنسان کی خودی کو قانون الٰہی کے تابع رہنے پر زور دیتے ہیں۔ اِنسان جب ہی غیر معمولی قوت کا مالک بن جاتا ہے جب وہ اپنی خودی کو قانون الٰہی کے تابع کر کے اِسے عمل میں لائے۔ قانونِ الٰہی کی پابندی کرنے والے نائب حق کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ نائب حق اپنی خودی کو عشقِ رسول کی بدولت استحکام عطا کرتا ہے۔ ایسے بندۂ خدا کا ہر عمل خدا کی خوشنودی اور رضا کے لئے انجام پاتا ہے۔ اُس کی نیند اُس کا جاگنا غرض اُس کا ہر عمل خدا کی خاطر وقوع پذیر ہوتا ہے۔

اقبال خودی کے ارتقاٗ اور استحکام کی جب بات کرتے ہیں تو اُن کے نزدیک فقط اِنسان ہی اپنی شخصیت کے استحکام میں مصروف کار نہیں بلکہ پوری کائنات کے حیاتیاتی نظام یا (Living Organism) میں اِسے ظہور پذیر دیکھا جا سکتا ہے۔ کائنات کی ہر شئے اپنے ظہور میں مصروفِ عمل ہے۔ علامہ اقبال فرانسیسی مفکر ہنری برگساں کی طرح تمام حیاتیاتی نظام کے اپنی شخصیت کی تکمیل کے عمل میں مصروف ہونے میں یقین رکھتے ہیں لیکن انسان ہی وہ ہستی ہے جس میں تخلیق کی خاطر اپنی قوت کو ارتقاٗ بخشنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جس کی بدولت اُس کی زندگی کے سامنے نشو ونما اور آزادی کے لامحدود امکانات کھُلے پڑے ہیں۔ خودی وہ غیر معمولی قوت ہے جو معمولی شئے کو بیش بہا کر دیتی ہے لیکن اس کے برخلاف ضعف خودی بڑی سے بڑی شئے کو حقیر اور معمولی بنا سکتی ہے۔ کائنات مسلسل ارتقاٗ کی طرف رواں دواں ہے۔ فرانسیسی مفکر برگساں بھی نظریہ ارتقاٗ کے قائل ہیں لیکن اُن کے یہاں اس ارتقا کا کوئی مقصود و منتہا نہیں جب کہ اقبال کے نزدیک اس ارتقاٗ کا باقاعدہ ایک مقصد ہے اور وہ اِنسان کو نیابت الٰہی کے منصب پر دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ خودی سے کائنات کی زندگی قوت حاصل کرتی ہے اور بے بہا ہو جاتی ہے۔ اقبال نفیٔ ذات اور ضعف خودی کے اسباب پر بھی غور و فکر کر چکے ہیں۔ وہ یونانی مفکر افلاطون کو گوسفند اِس لئے کہتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک اُنہوں نے اس رزم گاہ حیات کی تاب نہ لا کر اعیان نامشہود میں پناہ لی اور خیالی دُنیا کی وکالت کر کے لوگوں کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ تاہم بعض اقبال شناسوں کے نزدیک افلاطون اقبال کی اس شدید تنقید کا مستحق نہ تھا کیونکہ اُنہوں نے بھی اپنی تصنیف ''جمہوریہ'' میں بہتر زندگی کے لئے عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کے انحطاط کو بالخصوص اور ایشیائی اقوام کو بالعموم دیکھ کر خودی کا نظریہ پیش کیا۔ وہ غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر نفیٔ ذات کے قائل ہو گئے ہیں۔ اُن کا مقصد مسلمانوں کے فکر و عمل کو مثبت تعمیری اور صالح بنانا تھا تا کہ وہ حقیقی معنوں میں مسلمان کہلائے جا سکیں۔ قرآن کی رُو سے انسان آزاد شخصیت کا امین ہے جسے اُس نے بڑا ہی خطرہ مول

کر قبول کیا۔ ہر نفس اپنی تعمیر کے لئے مصروف کار رہتا ہے اور یہ کتنی ہی خوابیدہ، غیر مشکوک قوتوں اور امکانات کا محافظ ہے۔ اِس کے ارتقاء کے لئے اِنسان کو تمام طرح کی صعوبتوں اور چیلنجوں کے سامنے خود کو لا کھڑا کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کی کشمکش سے فرار حاصل کرنے کی صورت میں اُس کی صلاحیتیں ظہور پذیر ہونے سے رہ جائیں گی۔ چنانچہ اقبال اِنسان کو زندگی کی مشکلات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور زمانے کی رو میں بہہ جانے کے برخلاف بازمانہ بہ ستیز کی تلقین کر کے اُسے عروج پر پہنچانے کے لئے تقدیر سازی کا پیغام دیتے ہیں۔

اقبال کی پہلی فارسی تصنیف

''اسرارِ خودی'' کا منظوم کشمیری ترجمہ از غلام احمد ناز کولگامی

جموں وکشمیر میں اقبال شناسی کا موضوع چونکہ اپنے اندر خاصی وسعت اور تنوع لئے ہوئے ہے، اِس لئے اِس کا احاطہ کرنے کے لئے کئی کتابوں کی تصنیف وتالیف درکار ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں کلام اقبال کے کشمیری تراجم میں سے اُن کی پہلی فارسی تصنیف مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے منظوم کشمیری ترجمہ پر بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجمہ پر بات کرنے سے پہلے اصل تصنیف یعنی ''اسرارِ خودی'' پر مختصراً اظہارِ خیال کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مثنوی ''اسرارِ خودی'' اقبال کی وہ اجتہادی تصنیف ہے جس میں اُنہوں نے لفظ خودی کو، جسے عام طور پر غرور، تکبر اور نخوت کے منفی معنوں میں استعمال کر کے اِسے فنا کر دینے پر زور دیا جاتا رہا ہے، ایک باقاعدہ اور مُثبت اصطلاح کے طور پر برت کر اِس سے شعورِ ذات، احساسِ نفس جیسے معانی مراد لئے گئے ہیں۔ اقبال فرد سے اپنے اندر کی مخفی صلاحیتوں کی شناخت کرنے اور پھر انہیں قانونِ ایزدی کے تابع کر کے بروئے کار لانے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح خودی کو مسلمان کر دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ وہ شیطنت بن جاتی ہے۔ اقبال نے خودی کے تین مراحل تجویز کئے ہیں ا۔ اطاعت ۲۔ ضبطِ نفس ۳۔ نیابتِ الٰہی۔ فرد پہلے دو مرحلوں کو طے کرتے ہوئے نیابتِ الٰہی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے، خودی کو تقویت یا استحکام عطا کرنے کے لئے عشقِ رسولؐ اختیار کرنے پر بے پناہ زور دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی ایک نہایت وسیع پس منظر کے تحت تصنیف کی ہے۔ اُس دور کی عالمی صورتِ حال بالخصوص اُمتِ مسلمہ کے انحطاط کو نظر میں رکھتے ہوئے اقبال اُنہیں دوبارہ اپنی عظمتِ رفتہ سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے، ساتھ ہی عالمگیر سطح پر ایک صالح اور برتر معاشرہ کے قیام پر غور وفکر کر رہے تھے جسے ممکن بنانے کی خاطر اُنہیں اسلام کارگر ترین اور موثر ترین وسیلہ نظر آیا، کیونکہ مذہبِ اسلام، مذہبِ انسانیت ہے، جس میں ذات پات، رنگ ونسل اور جغرافیائی حدود وقیود کے تمام امتیازات بے معنی ہیں۔ اِسطرح رفتہ رفتہ پوری دُنیا پر اقبال کے آفاقی پیغام کی اہمیت واشگاف ہونے لگی۔ سب سے پہلے عربی

کے ایک عالم اور انگریز مستشرق رینالڈ اے نکلسن (R.A. Nicholson) نے اقبال کی اس اجتہادی تصنیف سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو کر اقبال سے اس کے ترجمے کی اجازت چاہی جو اُنہیں مل گئی۔ اُن کا منظوم ترجمہ اسرار خودی انگریزی زبان میں "Secrets of Self" کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہو کر منصہ شہود پر آیا۔ انگریز مستشرق نے ترجمہ پر ایک فکر انگیز دیباچہ تحریر کر کے اقبال کے افکار کی اہمیت کا احساس دلایا۔ نکلسن کا یہ ترجمہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ بعد ازاں کئی دوسری زبانوں جیسے اُردو، عربی، انڈونیشیائی، عربی، پشتو، سندھی اور کشمیری میں بھی اس کے کئی ترجمے شائع کئے گئے۔

فردوس برروئے زمین کشمیر، اقبال کے آبا و اجداد کا وطن رہا ہے۔ اِس جنت نظیر خطے اور یہاں کے محکوم عوام کے مختلف مسائل کے تئیں اقبال کی دلی ہمدردی کا احساس اُن کے کلام منظوم و منثور کے علاوہ اُن کی عملی کوششوں سے ہوتا ہے۔ اقبال کشمیر کمیٹی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں اور مظلومین کشمیر کی خاطر چندہ جمع کرنے کی مہم میں بھی برابر کے حصہ دار رہے ہیں۔ اِسی طرح انجمن کشمیری مسلمانِ لاہور کے بھی سیکرٹری کے فرائض بھی اُنہوں نے انجام دئے ہیں۔ اقبال جیسے مایہ ناز سپوت کی عالمِ انسانیت بشمول اہالیانِ کشمیر کے تئیں خدمات کے پیش نظر یہاں کے علمی اور ادبی حلقے اُنہیں وقتاً فوقتاً مختلف پیرایوں میں خراج پیش کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ جذب و شوق کے ساتھ برابر جاری ہے۔ کشمیر میں اقبال پر ہوئے کام کو مختلف عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر اقبال پر تصانیف و تالیفات کی اشاعت، اقبال پر منظومات اور متفرق اشعار جو اُن کے خراج تحسین پر مشتمل ہیں، جلسۂ کشمیر کے شعبۂ اُردو اور اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے زیر اہتمام تحریر کرائے گئے ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالات، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام سے رسالہ شیرازہ (اُردو و کشمیری) کے اقبال نمبر، پرتو اقبال، زءژء بلم (علامہ کے کلام کا انتخاب اور اُس کا کشمیری ترجمہ)، اقبال نمائش، اقبال کے زیر اثر کہی گئی نظمیں، غزلیں اور متفرق کلام، اور کلامِ اقبال کے منظوم کشمیری تراجم، وغیرہ وغیرہ۔

کلام اقبال کے تراجم جہاں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں، وہاں اِس کام میں شعرائے کشمیر نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ بعض شعراء نے اُن کے مبسوط مجموعوں کے منظوم ترجمے کئے ہیں اور بعض نے جستہ جستہ اُن کی غزلیات، منظومات اور کلام کے مختلف حصّوں کو کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے۔

خطۂ کشمیر کے موضع سوپٹ ٹنگہ پورہ، تحصیل کولگام ضلع اسلام آباد (موجودہ ضلع کولگام) کے مشہور شاعر غلام احمد نازؔ کولگامی وہ پہلے کشمیری شاعر ہیں جنہوں نے اقبال کی پہلی فارسی تصنیف مثنوی

''اسرار خودی'' کا (جس کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی ہے) منظوم ترجمہ ایرانِ صغیر کی زبان کشمیری میں کیا۔ یہ ترجمہ اقبال پر سب سے زیادہ وقیع کام کرنے والے نمائندہ ادارے اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا۔ بعض لوگوں کو یہ تسامح ہوا ہے کہ غلام قادر اندرابی (کشمیری) کا منظوم ترجمہ ''بالِ جبریل'' کلام اقبال کا پہلا منظوم ترجمہ ہے، لیکن غلام قادر اندرابی[1] اور غلام احمد نازؔ کے ترجمہ بالِ جبریل اور اسرار خودی کے سنِ اشاعت کا ہم جب موازنہ اور مطالعہ کرتے ہیں تو اوّلیت کا سہرا غلام احمد نازؔ کے سر باندھنا پڑتا ہے۔

بہر حال بات ہو رہی ہے غلام احمد نازؔ کولگامی کے منظوم ترجمہ اسرار خودی کی۔ اس کتاب کا پیش لفظ اُردو کے نامور ادیب اور اقبال شناس ممتاز حسن نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کے تعارف کے مطالعے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ نازؔ کولگامی کو یہ ترجمہ کرنے کی تحریک کشمیری زبان ہی کے ایک ادیب غلام رسول طاؤس بانہالی سے ملی ہے۔ موصوف اِس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''پرُس یمنی دوہن اَسی نازؔ صاٗب مے سمکھنہِ کراچی پیٹھ راول پنڈ آمتیٖ سیٹھا بحثہٕ پتہٕ کورمے نازؔ صابس اسرار خودی ہندہ ترجمک سُہ انگریزی نسخہٕ حوالہ یُس ڈاکٹر نکلسن (Dr. Nicholson) کورمت چھ۔ میون مدا اوس نازؔ صاٗبس کُنہ پاٗٹھی سُہ مشرومُت سبق یاد پاوُن یمہ باپت علامہ اقبالہِ سند تھدِ پاےٚکی کانہہ ووستاد آسُن گژھِ ہے۔ شکر چھ کہ میون مُدا سپن پُورہٕ تہٕ نازؔ صاٗبنہِ شاعری یَتہِ لگ بھگ تقریبن اِرداہ (۱۸) وریہ پتہٕ دوبارہ زندگانی''۔[2]

۱۔ غلام قادر اندرابی کے منظوم ترجمۂ بالِ جبریل کی اشاعت اول ۱۹۸۲ء میں ہوئی ہے۔ (اشاعتِ ثانی ۱۹۸۶ء میں ہوئی ہے)

۲۔ ترجمہ:۔ گزشتہ برس انہیں ایام کے دوران نازؔ صاحب کراچی سے راولپنڈی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کافی بحث کے بعد میں نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمے کا وہ نسخہ نازؔ صاحب کے سپرد کیا جو ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے۔ میرا مقصد نازؔ صاحب کو کسی بھی طور وہ فراموش شدہ سبق یاد دلانا تھا جس کے لئے علامہ اقبال ہی کے جیسا کوئی بلند مرتبت اُستاد ہو۔ شکر ہے کہ میرا مقصد پورا ہوا اور نازؔ صاحب کی شاعری نے بھی تقریباً اٹھارہ برس کے بعد حیاتِ نو حاصل کی۔ کاٗشر اسرار خودی ..... غلام احمد نازؔ کولگامی۔ طبع دوم ۱۹۸۳ء۔ زان۔ ص۔ ط

اقبال نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اُردو سے کیا تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، وسیع اور عمیق مطالعے کے نتیجے میں اُن کے فکر ونظر میں بتدریج ارتقاء ہوتا رہا۔ اپنے دقیق افکار کو اظہار کی شکل دینا اور اُنہیں وسیع حلقوں تک پہنچانے کے لئے اُنہیں اُردو کے مقابلے میں فارسی زبان زیادہ موزون محسوس ہوئی، چنانچہ وہ اسی زبان کو زیادہ تر اپنے افکار کا ذریعہ بناتے رہے۔ جہاں تک غلام احمد ناز کولگامی کے منظوم کشمیری ترجمۂ اسرار خودی کا تعلق ہے، غلام رسول طاؤس بانہالی نے کشمیری زبان کو چھوٹی زبان یا کم سن (لوُٹ) قرار دیا ہے۔ فارسی زبان کی حلاوت، شیرینی اور گہرائی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس زبان میں علاّمہ کے دقیق افکار کو منتقل کرنا آسان کام نہ تھا، ناز صاحب فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں کے مابین نمایاں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوّل الزکر کو گلستان اور ثانی الزکر کو کلی (پوشہِ ٹور) سے تعبیر کرتے ہیں۔

گلستان پارسی کے پھولوں کی بوقلمونی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ کشمیری زبان کی فارسی کے مقابلے میں تنگ دامانی کا بخوبی شعور واحساس رکھتے ہیں، تاہم ترجمے میں اقبال کے خیالات اور خودی کے موضوع کی روح کو منتقل کرتے ہوئے اُنہوں نے خاصی احتیاط برتنے کا اعتراف کیا ہے۔ کہیں کہیں اقبال کے کسی شعر میں درآئے معنی کو منتقل کرنے کی غرض سے ایک سے زائد اشعار مخصوص کردئے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر مصرعے کے عوض مصرعہ اور شعر کے عوض شعر برتنے کا التزام کیا ہے۔ ترجمہ کے دوران شہر اور دیہات دونوں میں بولی جانے والی کشمیری زبان کے الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ ترجمے کے ابتدائی صفحات میں مترجم نے ''پَنٕنۍ کتھ''، یعنی اپنی بات عنوان کے تحت کئی خیالات کا اظہار کیا ہے، جن میں بعض بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور ناز صاحب کے نظریۂ شعر کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی بات کا اختتام چند اشعار پر کیا ہے جن میں شاعر اُسی کو قرار دیا گیا ہے جس کی ذات ظلمات میں نور بکھیرنے کا کام انجام دے۔ یعنی اُن کا نظریۂ شعر اخلاقی اور مقصدی ہے۔ اُن کے نزدیک شعر تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ چنانچہ دُنیا کی کسی قوم پر جب غفلت طاری ہوتی ہے تو شاعر اپنی آواز بلند کرکے اُسے خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ یہ آواز مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے، کبھی رومیؔ، تو کبھی عطارؔ، کبھی اقبال تو کبھی سُورداس اور کبھی کالیداس۔ ترجمہ کار نے خودی کی پیشکش کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ کی اس کاوش اور فلسفۂ خودی کی اہمیت پر انہیں لایق استحسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

خودی ہند اسرار کٔرۍ موزون تِمؠ
سانہٕ باپتھ ہور جگرک خون تِمؠ

(یعنی اُنہوں نے (اقبالؔ نے) خودی کے اسرار موزون کرکے ہماری خاطر اپنا خون جگر بہایا۔)

جب فرد اپنی خودی کو عمل صالح کی بدولت مستحکم کر کے مرتبۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے تو اُسے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے، نازکولگامی کو اقبال کی اس مثنوی میں حیاتِ سرمدی کا نشان نظر آیا، غالباً یہ وہ بنیادی سبب ہے جس کے تحت انہوں نے اس مثنوی کے ترجمے کا بیڑا اُٹھایا۔

ترجمہ کاری کا عمل نہایت سنجیدہ عمل ہے۔ اِس میں کسی تخلیق کو از سرِ نو پانا ہوتا ہے، چنانچہ اِسے Recreation (یعنی دوبارہ تخلیق یا تخلیق نو کے لفظ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ترجمہ کاری کے ہر فن کی طرح اپنے لوازمات ہیں، جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس زبان سے کسی تخلیق کا ترجمہ کر رہا ہو اور جس زبان میں کر رہا ہو، اُن دونوں زبانوں کے لِسانیاتی عمل سے واقفیت رکھتا ہو۔ نیز اُس کا کام بشریاتی یعنی Anthropological بھی ہے۔ ترجمہ کار کی دونوں زبانوں کی تہذیب، ان کے مزاج، ان کے لب ولہجہ یا آہنگ سے آگاہی لازمی ہے، بالخصوص جب وہ کسی کلامِ منظوم کا منظوم ترجمہ کر رہا ہو۔ مذکورہ لوازمات کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں جو لفظی ترجمے سامنے آتے ہیں اُنہیں کو دیکھ کر کسی تصنیف یا تخلیق کے مقابلے میں ترجمے کے کام کو کم تر سمجھا جاتا ہے، ورنہ ترجمے کا کام اپنے لوازمات کی تکمیل کے پیشِ نظر کسی بھی طرح تخلیقی کام سے کمتر نہیں۔

نازکولگامی ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ کرنے سے پہلے اقبال کی دو۲ نظموں شکوہ اور جوابِ شکوہ کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ ''معراج نامہ'' کے نام سے اُن کی پہلی تصنیف خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کا کلام کشمیری زبان میں تین حصوں میں مدوّن ہو کر کلامِ ناز کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھے شاعر تھے، اِس لئے اُن کی شعری صلاحیتیں بھی اسرارِ خودی کے منظوم کشمیری ترجمے میں جا بجا کارفرما نظر آتی ہیں۔ ترجمے کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد اِس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اِس میں وہ رُوح یقیناً موجود ہے جو اصل کتاب میں موجزن ہے۔ ایسا ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ ترجمہ کار کسی مصنف کا بوجھ اُٹھا رہا ہے اور اُس کے افکار کو گراں محسوس کرتے ہوئے اُس کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں، بلکہ اُنہوں نے ایک معاملہ فہم اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے اصل تصنیف سے شہد کی مکھی کی طرح پھولوں کا جوہر نکال کر نہایت عرق ریزی سے قارئین کے سامنے ایک خاصے کی چیز رکھ دی ہے۔ بعض مقامات پر ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی تخلیق کا ترجمہ نہیں بلکہ اصل تخلیق کا مطالعہ کر کے اُس سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اقبال جیسے رفیع المرتبت فلسفی شاعر کے افکار کی باریکیوں اور گہرائیوں کو سمجھنا، اُن سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا اور اُن کے تئیں شایاں شان برتاؤ رکھنا اُن کے کسی بھی زبان کے ترجمہ کار کے لئے دعوتِ مبارزت

سے کم نہیں۔ یہاں تو نکلسن[1] جیسا عربی اور فارسی دان عالم بھی بعض اوقات غچا کھا جاتا ہے۔ ناز کولگامی کے ترجمہ کو پڑھ کر ایسا نہیں لگتا کہ وہ اصل تخلیق سے باہر نکل کر پھیل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے خود کو اصل تخلیق کے قریب رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ تخلیق اوّل کے احساس یا موجودگی سے بے نیاز ہوتے نہیں دکھائی دیتے۔ ایسا کرتے ہوئے پاسِ ادب اور اقبال کی شعری عظمت دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک مخصوص لہجہ ہوتا ہے، کشمیری زبان بھی اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتی ہے، کسی تخلیق کے ترجمے میں زندگی اور توانائی کی شناخت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کیا ترجمہ کار ایک مخصوص لہجہ کو برقرار رکھ پایا ہے یا نہیں؟ ناز کولگامی کے ترجمے کو شروع سے آخر تک پڑھیئے، ہر جگہ ایک خاص لہجے کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اب ہم ''اسرار خودی'' اور اس کے منظوم کشمیری ترجمے (جو اس وقت زیر بحث ہے) سے چند مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کریں گے تا کہ اِس بات کا تعین ہو سکے کہ اقبال کے افکار کو کشمیری زبان میں ڈھالنے میں کشمیر سے دُور رہ کر ہمارا یہ کشمیری الاصل شاعر اور افکارِ اقبال کا شیدائی کہاں تک

ا۔ نکلسن نے اسرار خودی کے ایک عنوان ''در بیان اینکہ خودی از سوال ضعیف میگردد'' کے تحت آنے والے ایک شعر ؎

تا بکے در یوزۂ منصب گنی صورتِ طفلان زنے مرکب گنی

کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

How long wilt thou sue for office
And ride like children on a woman's back

مترجم نے زنے کو زنے یعنی woman سمجھ کر نے۔ کا ترجمہ Reed کی بجائے زنے (زنِ) یعنی woman کر دیا۔

یا ؎ از رموزِ زندگی آگاہ شو ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

کا ترجمہ نکلسن یوں کرتے ہیں۔

Gain knowledge of life's mysteries!
Be a tyrant! ignore all except God!

پروفیسر غلام رسول ملک ایسے ترجمے کو ترجمہ نہ سمجھتے ہوئے اسے اصل کی "travesty" سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ نکلسن نے بڑی آسانی سے ظالم و جاہل کے فقرہ میں واؤ عطف کو گرا دیا ہے اور شعر کے مصرعۂ ثانی کو نا تمام کر کے ایک ایسے مفہوم سے گرانبار کر دیا جو زبان یا تخیل کی کسی بھی کھینچ تان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ The western Horizon-(2009) P-169

کامیاب ہوا ہے اور کس حد تک اصل سے وفاداری کا حق ادا گیا کیا ہے۔ یہی وہ مقام یا مرحلہ ہے جہاں تخلیق اوّل اور ترجمے کا موازنہ کرنے کی احتیاج ہے۔

پیکر ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
عالمچ ہستی خودی ہُند اکھ نشان — سیر تمہ گژھے چھےِ یہِ کینژھا چھنک وچھان
خویش را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
پان پنہ نُے خودیہِ یلہِ بیدار کور — تَمی خیالک عالماہ اظہار کور
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِاُو پیداست از اثباتِ اُو
تس کھٹت ذاتس اندر دنیا چھِ کاتؔ — غیرِ حق نون دراو اثباتہٕ سّتیٚ
درجہاں تخم خصومت کاشت است — خویش را غیرِ خود پنداشت است
پان پنہٕ نُے غیر زُونن پانہ تَمی — دُنیہس ووو دشمنی ہُند دانہ تَمی
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تافزاید لذتِ پیکار را
غار پنہ نی اَندر تَمی پاٚدا کورن — تیٚ کرِت لذّت سیٹھاہ وارس دِژن
بہریک گُل خونِ صد گلشن کُند — از پئے یک نغمہ صد شیون کُند
یود اَتُن آسیس اکس پوشس بہار — چھے کران تتھ پت سیٹھاہ گلشن نثار
شعلہ خود درشرر تقسیم کرد — جز پرستی عقل را تعلیم کرد
باگرن تبزگل پٹن تبزبن اندر — عقل ہیچھ ناوُن جُزس پوزا ژہِ کر
گر بہ فطرت پختہ تر بودے نگیں — از جراحتِ ہا بیا سودے نگیں
کرانکس ہر گاہ پختہ فطرت آسہِ ہے — زخمہ نِش بَچنچ تمس وَتھ آسہ ہے
می شود سرمایہ دارِ نامِ غیر — دوشِ اُو مجروح بارِ نام غیر
غاٚرسُندِ ناوُک پھکبن پیٹھ چھوک چھُ تس — بارِ تہمت چھُن یہوی سرمایہِ بس
چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است — ماہ پابند طوافِ پیہم است
یام کُر محکم زمینن پانہٕ ذات — زُون چھس پھیران انڈ کی دوہ تہٕ رات

ہستی مہراز زمیں محکم تراست
پس زمیں مسحور چشمِ خاور است

دَر زمینکِ کھوتہ اختاج خودی
چھے توے موحتاج سوے اختا بچی

جنبش از مژگاں برد شانِ چنار
مایہ دار از سطوتِ اُو کوہسار

بونہ ہندِ تھز رُک تہ بجرُک وچھتہ شان
چھنہ اُچھن فرصت سوٹھِہ وہرچ دِوان

تارو پودِ کسوتِ اُو آتش است
اصلِ اُو یک دانۂ گردن کش است

نارِ پنہِ وونت پلو لاگتِ چھِ تس
چھُس اثر بیالکُ توے تھز کاَر چھُس

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست
می کشاید قلزمے از جوئے زیست

ییلہِ انان سو مبرت پنُن طاقت خودی
سودر سپدان آبہ یود کول خودی

گہرائیٔ فکر کی حامل اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کو کشمیری نظم میں ڈھالنا بجائے خود بڑی بات ہے۔ یہاں ترجمہ کار کی تخلیقی استعداد کے ساتھ ساتھ اُن کی انتقالِ معانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے مختلف مصرعوں اور اشعار میں در آئی علامات، اشارات اور آیات کے حوالوں کی حواشی میں نشاندہی کر کے انہیں قارئین کے لئے قابل فہم بنایا ہے۔ جس سے ترجمہ کار کی عربی دانی کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے اُنہیں کئی مقامات پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تاہم وہ نہایت ہی حسن وخوبی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے رہے ہیں۔ اِس ترجمے کی نسبت جب میں نے کشمیری زبان وادب کے ایک معتبر ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر رحمان راہیؔ سے اُن کی رائے معلوم کی تو اُنہوں نے مجھ سے اس کے اشعار مختلف مقامات سے سنانے کے لئے کہا، اشعار سن کر مندرجہ ذیل الفاظ میں اس ترجمے پر اپنی رائے رقم فرمائی:

''مرحوم ناز کولگامی صابُن ''اسرارِ خودی'' ہند کاشر ترجمہ وُچھ مے یہِ ڈِلۍ زتہِ پیٹھہ پیٹھی، تہ یہِ زِینتھ گوس خوش زکاشر زبان چھنہ رسہ کیسرِ گمژ باسان۔ اکہ زبانۍ ہند کانہہ تہ تخلیقی تحریر بیس زبانۍ منز پھِرن چھنہ سہل، زالن والو چھُ یہ کارنا ممکن تہِ گنز رو ومُت، وَں گو ترجمہ کرنس چھِ پنٕنۍ اہمیت۔ زیرِ نظر ترجمہ چھُ یمہِ کنۍ لایقِ توجہ باسان زِ امِہ ڈِکہ چھُ پرَن وول اصل مصنف یعنے علامہ اقبالس کم قلیلاہ نکھہ واتان، کہیں نے تہ علامہ سُند فکری وڈو چھُ زانن تگان۔ یہِ ممکن بناوِتھ چھے

مرحوم نازصابن کاشُر زانن والنین لادءنے تھاوُمژ"[1]

نازکولگامی نے "اسرارخودی" کے منظوم کشمیری ترجمے کے ذریعے دوہری خدمت انجام دی ہے۔ اوّل زبان کشمیری کے تئیں اپنی بے پناہ محبت اور عقیدت کے باعث اس میں لعل وگوہر جڑ دئے ہیں، دوم اقبال کے فلسفہ ٔخودی سے اہلِ کشمیر کو واقفیت بہم پہنچائی، اُن کی یہ خدمت قابل تحسین ہے ۔

دل تبنہ لاوو راز ہو نزن مو ختہ ہَرونا
یتھ کاشر کس آستانس چُونہٕ جرونا

کشمیر میں اقبال شناسی کے سلسلے میں، بالخصوص کلامِ اقبال کو کشمیری زبان میں منتقل کرنے کے حوالے سے، جو مسائل درپیش ہیں، وہ کم وبیش وہی ہیں جو دوسری زبانوں میں اقبال کے کلام کو ڈھالتے ہوئے مترجمین کو پیش آتے رہے ہیں، اِن مسائل کو حل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ اقبال کے افکار کی بلندی اور گہرائی سے قرارواقعی شناسائی حاصل کی جاسکے۔ فکر اقبال کو کسی دوسری زبان میں ڈھالنے کے لئے اقبال کے پورے فکری نظام، جس میں قرآن وحدیث کے علاوہ اسلامی اور مغربی فکر وفلسفے کے علاوہ مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی، اُردو، انگریزی اوران کے ادب سے گہری واقفیت لازمی ہے۔ میرے خیال میں کلامِ اقبال کے بعض حصّوں کا جستہ جستہ ترجمہ کرنے کے بعد اقبال کے پورے فکری سرمائے کو کشمیری زبان میں ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ عالمی سطح پر موجودہ پُرتناوصورت حال اور بالخصوص کشمیر اور اہل کشمیر کی ناگفتہ بہ حالت کے پیشِ نظر اس کے بغیر کوئی چارۂ کارنہیں۔ اقبال نے سالہاسال پیشتر اپنے کلام منظوم ا ورنثری تحریروں میں جس محکوم ومجبور وفقیر کشمیر کی تصویر کشی کی تھی، آج کشمیر اُس سے کہیں زیادہ محکوم ومجبورو فقیر ہے۔ اہلِ نظر اقبال کو بدلتے زمانے کے نت نئے تقاضوں کے آئینے میں دیکھنے پر خاصا زور دے

۱۔ [1]۔ (پروفیسر) رحمان راہی۔ ۱۵۔ اپریل ۲۰۱۱ء

ترجمہ۔ میں نے مرحوم نازکولگامی کے ترجمۂ اسرارخودی پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ یہ محسوس کرکے مجھے مسرت ہوئی کہ کشمیری زبان کسی بھی صورت خفت کے احساس سے دوچارنہیں ہوئی ہے۔ کسی زبان کے فن پارے کوکسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ ماہرین نے اِس عمل کو ناممکن امور میں گردانا ہے۔ تاہم ترجمے کی اپنی اہمیت ہے۔ زیرنظر ترجمہ اس اعتبار سے لائق اعتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قاری مصنف یعنی علامہ اقبال کے مافی الضمیر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ کم ازکم علامہ کی فکری پرواز سے آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔ اِس خدمت کے پیش نظر اہل کشمیر مرحوم نازکولگامی کے مرہون منت ہیں۔

رہے ہیں، بلکہ پاکستان کے دانشور، شاعر، ادیب، مترجم اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی بہت پہلے اقبال کے افکار کی وسعت، تنوع اور گہرائی کے پیش نظر اس کے لئے کسی عظیم بوطیقا کے ابھی ظہور میں آنے کی ضرورت پر زور دیا تھا کیونکہ انہیں کے الفاظ میں ''بڑے آدمیوں کی طرح بڑی کتابیں بھی Charisma کے اسرار کے تحت ظہور میں آتی ہیں''۔ ہمارے سامنے انگریز مستشرقین کی کئی مثالیں ہیں جنہوں نے بے پناہ مشقتیں اُٹھا کر کے ابوالمغیث الحسین بن منصور حلاّج، مولانا جلال الدین رومی، اور علاّمہ اقبال پر قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ اقبال اور اقبالیات کے بہ فضلِ الٰہی خاصے روشن امکانات ہیں، بشرطیکہ مصلحتوں، سہل انگاریوں اور گھسی پٹی راہوں پر چلنے کی خو ترک کر کے ہر منزل کو مرحلہ سمجھ کر مسلسل نئی منزلوں کا سُراغ پانے کا سلسلہ جاری رہے، تاکہ خوب سے خوب تر کی تلاش کی جا سکے بقول علاّمہ اقبال ؎

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

اقبال کے فکر وفلسفہ پر اُم الکتاب کے اثرات

لغت میں اُم الکتاب کے معناں سورۂ فاتحہ یا قرآن مقدس کے ہیں۔ سورۂ فاتحہ بندے کی جانب سے گمراہی سے محفوظ رہنے اور صراطِ مستقیم کی اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے بارگاہِ ایزدی میں وہ دُعا ہے جس کے عوض اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندے کی دین و دنیا میں فلاح کی خاطر اُسے ایک آئین سے نوازا، جس کا نام اُم الکتاب یا قرآن مقدس ہے۔ قرآن کی معنی ہیں بار بار پڑھی جانے والی کتاب۔ قرآن کی رُو سے اگر اس صحیفہ کو غیر معمولی طور پر قوت وصلابت رکھنے والے فلک پیما پہاڑوں پر نازل کیا جاتا تو وہ بھی خشیت الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لیکن مشتِ خاک سے بنائے گئے حضرت انسان، جسے اللہ جل شانہ نے مسجود ملائک ہونے کا اعزاز بخشا، ہی کا حوصلہ اور جگرداری ہے کہ بقول فارسی کے ممتاز صوفی شاعر لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؔ ؎

آسمان بارِ امانت نتواست کشید | قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

انسان کو دنیا کی تمام مخلوقات میں اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ یہ فضیلت اُسے عشق کی بدولت حاصل ہے، اور علامہ اقبال عشق کو خدا کے رسولؐ اور خدا کے کلام سے تعبیر کرتے ہیں ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد | حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور | خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش باغوشِ حیات | چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد[1]

---

1. Love proclaimed the birth of a being with a bleeding heart
Beauty trembled at the advent of a being with vision.
Nature worried that, out of a passive clay,
was born at last, a being.
Self creating, self-destroying, self-regarding
world went round from the heavens to the night of eternity
Desire unconscious of self, wrapt in slumber,
opened its eyes in the lap of life.
And Lo! a new world came into being!

انسان کی تخلیق اس کرۂ ارض پر نیابت الٰہی کی غرض سے عمل میں لائی گئی ہے۔ ذاتِ حق نے ختم المرسلین کی اُمت کو خاتم الامم بنایا ہے اور امت مسلمہ کو اُمت خیر بنا کر دنیا کی تمام امتوں کی قیادت کا کام سپرد کیا گیا ہے، جسے اقبال ساقی گری کی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس خدمت کی انجام دہی کیلئے قرآن کو ایک آئین کی حیثیت حاصل ہے اور مسلمان جب تک اس آئین کی پیروی کرتے رہیں گے، وہ دین و دنیا میں سربلند رہیں گے لیکن اس آئین کی پابندی ترک کرنے کے نتیجے میں وہ مغلوب کئے جائیں گے۔ بیسویں صدی کے ایک ممتاز مسلم مفکر حکیم الامت علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کے دردمند کی حیثیت سے مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا مشاہدہ کر کے اُن کے احیائے نو کے لئے عمیق غور و فکر کرتے ہوئے اپنی تمام ترقوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ اقبال کے اسلاف زندگی بھر خدا کی تلاش کرتے رہے لیکن اقبال اس کے برخلاف اپنی تمامتر عمر عزیز مسلمانوں کو پستی اور ذلت سے نکال کر اُنہیں دوبارہ اپنے عظیم مقام پر فائز کرنے میں مصروف رہے۔ اقبال کے ترجمہ کار اور مشہور مستشرق رینالڈ۔ اے۔ نکلسن کے الفاظ میں اقبال نے مسلمانوں کو از سرِ نو قرآن کی طرف بلایا۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں کہتے ہیں

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز　　دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوے بنہ کردارِ خود را　　قیامت ہائے پیشیں را بر انگیز[1]

چنانچہ اقبال اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے ہی مرشد روحانی مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ کی طرف ایک حقیقی انسان کی تلاش و جستجو کرتے ہوئے اپنا مخصوص فلسفہ، فلسفۂ خودی مرتب کرتے رہے۔ مشرق کے اس غیر معمولی طور پر وسیع المطالعہ مفکر شاعر نے شرق و غرب کے علمی، ادبی اور فکری سرمائے سے کما حقہ استفادہ کرتے ہوئے اپنے فلسفۂ خودی کی بنیاد قرآن حکیم کی سورۂ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۵ پر رکھی۔ جس کا اعتراف خود اُنہوں نے اپنے باقاعدہ شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم سے ایک ملاقات یا صحبت کے دوران کیا۔ اس آیت مبارکہ میں اہل ایمان پر خودی کی حفاظت کو فرض قرار دیتے ہوئے اُنہیں یوں ہدایت کی گئی ہے۔

یا ایھاالذین اٰمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا ھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمعیاً فینبئکم بما کنتم تعملون۔

---

1. Keep the Quran as a mirror before you.
You have completely changed, run away from yourself.
Fix a balance for your deeds (so that you may be able to)
Stir a commotion which your forbears stirred in the past.

(ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر فرض ہے خودی کی حفاظت، اگر تم ہدایت پر ہو، تو وہ شخص، جو گمراہ ہے، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سمجھو کہ اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا (تا کہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے)۔

جس طرح ایک بیج میں پورا درخت مخفی یا موجود ہوتا ہے اُسی طرح قرآن کی ہر آیت میں مشقت کے بعد نئے نئے جہانوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مرزا غالبؔ کا ایک شعر ہے

گوہر ز بحر خیزد، و معنی ز فکرِ ژرف　　برما خراج، طبع روانی نہادہ ای

یعنی جس طرح سمندر سے موتی برآمد ہوتے ہیں اُسی طرح گہری فکر سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا خراج ہے جو تو نے ہماری طبع رواں پر لگایا ہے۔

انسان اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک بحرِ بیکراں مضمر پاتا ہے

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود　　خرد ہر جا کہ پرزد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من　　کرانِ بیکراں در من نہاں بود

(There are a hundred worlds from star to star,
Whenever intellect flies; it finds new skies,
But when I looked deep into myself
Lo! a boundless ocean was hidden within me!

اسی لئے اقبال نے خودی کے روایتی مفہوم کے برخلاف اس سے خداشناسی، عرفان نفس اور شعور ذات کے معناں مراد لئے، جبکہ صوفیاء زیادہ تر خودی سے تکبر، غرور، استکبار اور نخوت وغیرہ کے معناں مراد لیتے ہوئے انسان سے اپنی خودی کو حقیر اور مذموم سمجھ کر اسے فنا کر دینے کی تعلیم دیتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں انسان اپنی زندگی اور اس دنیا سے بیزار اور مایوس ہو کر اپنے اندر چھپے لامحدود امکانات کو تلاش کرنے اور انہیں بروئے کار لانے سے بیگانہ رہا۔ وہ نباتات و جمادات کی مانند پابندِ تقدیر ہوا۔ اُس کے فکر و عمل پر اس تصور نے منفی اثرات مرتسم کئے، جب کہ قرآن انسان سے اپنی بے پناہ غیر معمولی صلاحیتوں اور استعداد کا عرفان حاصل کرنے اور انہیں کام میں لانے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کے زیر اثر اقبال اس دنیا کو ایک آزمائش گاہ قرار دیتے ہیں جہاں انسان کو قدم قدم پر نامساعد حالات اور بھاری رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تا کہ اس کی خودی کو پرکھا جا سکے۔ شیشے کو پتھر سے ٹکرا کر اپنی حیثیت کا علم حاصل ہو جاتا ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقانِ ذرا　　دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفان سے کیا ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

یا پھر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

تو اے اسیر مکاں، لامکاں سے دور نہیں وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

خودی میں ڈوب جا، غافل یہ سرِ زندگانی ہے نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

یاد رہے کہ اقبال نے فرد سے اپنی بے پناہ قوتوں اور استعداد کو قانونِ ایزدی کے تابع کرنے کی ہدایت کی ہے اور خودی کو قانون ایزدی کے تابع کر کے مسلمان کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں مسولینی اور ہٹلر کی مثال دی ہے۔ مسولینی نے محض جوع الارض کی تسکین کے لئے حبشہ کو پامال کیا جب کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ یہ قرآن کی تعلیمات ہی کا فیضان ہے کہ اقبال نے فرد سے رہ رہ کر خدا کی اطاعت کرنے اور ضبط نفس اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اطاعتِ الٰہی اور ضبط نفس کو اقبال تربیت خودی کے دو مراحل سے تعبیر کرتے ہیں اور ان دو مراحل کو طے کرنے کے بعد ہی نیابت الٰہی کے مقام بلند پر فائز ہوا جا سکتا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں خودی، جہاں احتیاج یا دستِ سوال دراز کر دینے سے ضعیف پڑ جاتی ہے، وہاں عشقِ رسول کی بدولت خودی کو استحکام بخشا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق جب تک نہ تم میرے محبوب کو اپنی جانوں سے، اپنے والدین سے اور اپنے عزیز و اقارب سے عزیز تر رکھتے اُس وقت تک تم عشقِ رسول کا دعویٰ کرنے میں ہرگز صحیح ثابت نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اقبال اپنی پہلی فارسی مثنوی اسرار خودی کے حصہ دوم رموزِ بے خودی میں، جسے اس مثنوی کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ فرد کی خودی کو جماعت کی خودی کے ساتھ مربوط کرنے اور عزت و توقیر حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

مثنوی کے دوسرے حصے یعنی رموز بے خودی میں قرآن کے تناظر میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملیہ اسلامیہ کے ارکان یعنی توحید اور رسالت کے بعد جو عنوان قائم کیا گیا ہے اُس کی رو سے ملت کا نظام آئین کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور ملت محمدیہؐ کا آئین قرآن پاک ہے۔ کردار کی پختگی شریعت کی اتباع سے ہے۔ مثنوی کے اختتام پر مطالبِ مثنوی کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

اقبال نے اسرار و رموز کی شکل میں اپنے تخلیقی سفر کا جو باقاعدہ آغاز کیا، اس میں اُن کے متقی والدین کی تربیت کے علاوہ خود اقبال کا قرآن پر مسلسل تفکر و تدبر کا نمایاں رول رہا ہے۔ کیونکہ قرآن بار بار افلا تفکرون، افلا تدبرون اور افلا تعقلون کے الفاظ کے ذریعے انسان کو غور و فکر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ علامہ کے والد گرامی شیخ نور محمد، اقبال کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں تلقین کیا کرتے تھے کہ

قرآن کو اس طرح پڑھا کرو جیسے یہ تم پر ہی نازل کیا گیا ہو۔ والد مکرم کی اس تلقین کو اقبال نے اپنی فطرت اور شخصیت میں تحلیل کر کے بعد بہت میں یہ شعر کہا ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس نے دنیا کو ایک نئے انقلاب، نئی تہذیب و ثقافت، نئے قانون، نئے عقائد اور انسانی زندگی کو ایک نئی روش سے متعارف کرایا۔ انسانیت کی تاریخ پر قرآن نے جتنا گہرا اثر ڈالا، اتنا کسی اور کتاب سے آج تک ممکن نہ ہو سکا اور نہ کبھی ہوگا۔ خود اقبال کثیر المطالعہ مفکر شاعر ہونے کے ناتے اس سرمدی کتاب سے سب سے زیادہ متاثر ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''فکر اقبال'' میں اقبال کو قرآن کا شاعر اور شاعر کا قرآن کہا ہے۔ اقبال نے حیات کے آخری برسوں میں، ضعف بصارت اور جملہ خرابی صحت کے باعث، مطالعۂ کتب تقریباً ترک ہی کر دیا تھا، تو وہ باقاعدہ طور پر قرآن کا مطالعہ کیا کرتے تھے، کبھی کبھار مثنوی رومی بھی پڑھتے تھے۔

اسرار و رموز کی تصنیف اور اشاعت کے بعد اقبال کئی اُردو اور فارسی مجموعوں کے ذریعے فارسی اور اُردو شعر و ادب کو گرانقدر سرمائے سے مالا مال کرتے رہے۔ اپنے شاہکار خطبات بعنوان The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں وہ فلسفۂ خودی کی مزید توسیعات اور فلسفیانہ تعبیریں پیش کرتے رہے۔ اقبال کا فلسفہ درحقیقت مذہبی فلسفہ ہے جسے انسان کی زندگی کے تمام تر شعبوں سے مربوط اور ہم آہنگ کر کے ناگزیر اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ دین اقبال کے نزدیک انسان کا ڈومسٹک افیئر (Domestic Affair) نہیں، وہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی کارفرمائی ناگزیر سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ عمرانیات کا، سیاسیات، کا، اقتصادیات کا، یا تعلیم کا شعبہ ہو، انسان کی حیات سے دین کا استخراج کر کے اُسے خیر سے یکسر محروم کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے خیال میں جب دین کو سیاست سے جدا کر دیا جاتا ہے تو چنگیزی باقی رہ جاتی ہے۔ دراصل ہمارے ذہنوں میں دین اور دنیا کے جدا جدا ہونے کی غلط فہمی راسخ ہو چکی ہے۔ ہم مادیت اور روحانیت کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن اسلام میں خدا، کائنات، کلیسا اور ریاست، اور مادہ اور روح ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک یا مکروہ دنیا کا باشندہ نہیں، جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے، ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ اسلام کا مذہبی نصب العین، اس کے معاشرتی نظام، جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے، دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا

تو بالآخر دوسرے کو بھی ترک کرنا لازم آئے گا۔

قرآن انسانی کی دنیوی اور اخروی زندگی دونوں کو پیش نظر رکھ کر دونوں میں توازن اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ انسان کی اخروی زندگی کو سنوارنے کی بار بار ترغیب دیتا ہے کیونکہ یہ دنیا بے ثبات ہے، اس لئے اس چند روزہ زندگی کے بجائے اُسے دائمی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اقبال قرآن کے تناظر میں موت کو انسان کی زندگی کا خاتمہ قرار نہیں دیتے بلکہ اس شام زندگی کو انسان کی دوامی یا ابدی زندگی کی صبح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے انسان سے منسلک اس کا ایک پہلو اس کے بااختیار ہونے کا ہے اور دوسرا تصور اس کے مجبور محض ہونے کا۔ قرآن میں جبر و قدر کے حوالے سے مختلف آیات درج ہیں۔ لیکن ہمارے فارسی شعرائے کرام کے زیر اثر جبر کا تصور اُردو شعراء پر بھی اثر انداز ہوا، جس کے نتیجے میں انسان کی بے بسی اور مجبوری کا رونا رویا گیا ہے۔ مثال کے طور پر خدائے سخن میر تقی میرؔ کے بقول ؎ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی، چاہتے ہیں سو آپ کرے ہے ہم کو عبث بدنام کیا، اس طرح انسان کو مجبور محض قرار دے کر اسے تقدیر کے حوالے کیا گیا جس کے نتیجے میں وہ عمل سے غافل ہوا اور تقدیر سازی کے عمل پر اس کا یقین ختم ہو گیا۔ لیکن انسان ایک باشعور، ذمہ دار اور اختیار رکھنے والی ہستی ہے، خدا کے قادر مطلق ہونے میں کوئی کلام نہیں، تاہم انسان مختار ہونے کے ساتھ ساتھ بعض معاملات میں مجبور بھی ہے، اس لئے ایمان تو جبر اور اختیار کے درمیان کی چیز ہے، لیکن انسان کو مجبور محض قرار دینا کسی بھی طور صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور کی قوتوں سے نوازا ہے۔ وہ خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے۔ خدا کا اپنی رضا سے بندے کو عقل و شعور کی قوتوں سے نوازنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سے خدا کی قدرت اور علم میں تحدید واقع ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ انسان اگر مجبور محض ہوتا تو روز جزا کو اس سے اپنے اعمال کا حساب کیوں طلب کیا جاتا۔ پھر جنت و دوزخ کا وجود بھی بے معنی ہوتا۔ لیکن قرآن کی رُو سے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس جہاں میں نیک اعمال انجام دینے والے اہل جنت کو قرآن بار بار حور و غلماں، مختلف نعمتوں اور انعامات کی بشارت دیتا ہے۔ جبکہ دوزخیوں کو اپنے برے اعمال کے عوض ملنے والے عذاب الیم سے بھی متنبہ کرتا ہے۔ اقبال نے اس تصور کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں سزا کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ دراصل یہ مسیحی عقیدہ ہے جو عام ہو چکا ہے۔ ورنہ قرآن کی رو سے آدم کا شجر ممنوعہ کا پھل چکھنا سرتابی، یا اس کی سرکشی یا بغاوت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے لامحدود امکانات کی تلاش اور ان کی کارفرمائی کا دوسرا نام تھا۔ اقبال کے نزدیک آدم کے باب میں جس جنت کا ذکر ملتا ہے اس سے مراد وہ روایتی جنت نہیں بلکہ یہ اس ابتدائی حالت کا نام ہے جہاں انسان عملاً

اپنے ماحول سے غیر متعلق اور غیر مربوط تھا جس کے نتیجے میں وہ ضروریات اور داعیاتِ بشری کی خلش سے ناواقف تھا۔ اقبال کے خیال میں قصۂ آدم سے قرآن کا مقصود اپنی اصلی ابتدائی حالتِ جمود سے بلند ہو کر اپنے آزاد ارادے کا اعلان کرنا ہے۔ باغِ بہشت سے انسان کو جو حکم سفر دیا گیا تھا وہ کسی نافرمانی کے باعث نہ تھا بلکہ وہ تو علامت تھی، انسان کی ادنیٰ سے اعلیٰ خودشعوری کی جانب پیش رفت کی۔

اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کے تارِ حریر دو رنگ میں شرق و غرب کے علماء و حکماء کے افکار و نظریات کا تحقیقی مطالعہ کر کے ان کا دقتِ نظر سے تجزیہ کیا۔ ان میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، شیخ مجدد الف ثانی، ابن خلدون، فیڈرک نطشے، ہنری برگسان، کارل مارکس، میکیاولی، افلاطون وغیرہ وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان علماء و حکماء کی تحریروں میں انہیں جہاں جہاں اسلام سے مماثل اور ہم آہنگ پہلو نظر آئے، اقبال نے ان کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ مثال کے طور پر اُنہوں نے سوشلزم کے ضمن میں کارل مارکس کی کاوشوں کی سراہنا کی اور کہا کہ کارل مارکس کے قلب میں مومنوں والا جذبہ ہے کہ خلق خدا کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے لیکن حیات و کائنات کی ماہیت اور خلاق وجود سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ان کے فکر کو کافرانہ کہا ہے۔ اقبال نے سوشلزم کو ہمارے کلمہ کے آدھے حصے یعنی لا الٰہ کی تعبیر قرار دیا اور یہ بتایا کہ اسے ابھی الا اللہ کی منزل طے کرنا باقی ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کیلئے اسے اسلام کا دامن تھامنا پڑے گا۔ "ضربِ کلیم" کی ایک مختصر سی نظم "لا والا" میں کہتے ہیں ؎

نہادِ زندگی میں ابتداء لا انتہا الاّ — پیام موت ہے جب لا ہوا الاّ سے بیگانہ
وہ ملت، روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقین جانو، ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

اسی طرح جرمن مفکر فیڈرک نطشے نے سپر مین کی تخلیق کے لئے حصول قوت کا جو نظریہ پیش کیا، اقبال اس سے جزوی طور پر متاثر ہوئے لیکن نطشے حصول قوت کے لئے جب اخلاق کی سرحدوں کو پار کرنے کی بات کرتے ہیں اور پھر خدا کے مر چکنے کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اقبال توحید کے علمبردار کی حیثیت سے ہمدردانہ لہجے میں کہہ اٹھتے ہیں ؎

اگر وہ مجذوب فرنگی ہوتا اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال نے ری کنسٹرکشن (Reconstruction...) کے تیسرے خطبے The Concept of God and Meaning of the Prayer" میں ذات الٰہ، کائنات اور انسان کے حوالے سے متوازن، فکر افروز اور غامض مباحث چھیڑے ہیں۔ اس خطبہ میں مشرق و مغرب کے حکماء کے تصورات پر گفتگو کی گئی ہے۔ خطبے میں ذات الٰہ کے مخلوقات سے تعلق پر بات کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ بعض

لوگوں کے نزدیک خالق نے اس کائنات کو ایک مخصوص عہد میں تخلیق کیا اور اس کے بعد وہ اس سے لاتعلق ہوگیا۔ اگرچہ یہاں اقبال نے کسی مخصوص نام کی نشاندہی نہیں کی ہے تاہم اقبال کا اشارہ ڈی۔اسٹوں (Deists) کی جانب ہے جن کے خیال میں خدا اور کائنات کا رشتہ معمار اور مکان کا یا گھڑی ساز اور گھڑی کا ہے۔ ایک بار مکان یا گھڑی تیار ہو جائے تو تخلیق کار کا اپنی تخلیق سے رشتہ منقطع ہوتا ہے اور اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کی تخلیق کس حال میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآن کی آیت۔ انی اقرب الیہ من حبل الورید کو نظر میں رکھیں، تو خدا کا تعلق ہمیشہ اپنے بندے سے قائم رہتا ہے۔ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر لمحہ اپنے بندوں کے حال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ خدا روح الارواح ہے۔ اپنے بندوں سے ہرگز الگ نہیں۔

یہ تھیں فکر اقبال کے بحر ذخائر سے صرف دو ایک مثالیں جنہیں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

اقبال کی کلّی فکر کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان یا فرد کی خودی کو مختلف مرحلوں سے گزار کر مرتبۂ کمال تک پہنچا کر ایک عالمگیر معاشرے کا قیام عمل میں لانے کے خواہاں رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہوگا جہاں بندگان خدا پر صرف خدا کی حکومت ہو، جہاں مذہب و ملت، رنگ و نسل، ذات پات، زبان اور جغرافیہ کے امتیازات بالکل نہ ہوں، جہاں کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہ ہو۔ جہاں فضیلت کا معیار قرآن کی یہ آیت ہو۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم، یعنی اللہ کے نزدیک مکرم وہی ہے جو متقی ہے۔ جہاں انسان توحید و رسالت کا اقرار باللسان کر کے تصدیق بالقلب بھی کرے۔ جہاں عشق رسولؐ کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے۔ جہاں ہر عمل خدا کی خوشنودی کے لئے انجام دیا جائے۔ ''جاوید نامہ'' میں، جسے فکر اقبال کی معراج کا مرتبہ حاصل ہے، فلک مریخ پر اقبال نے ایک مثالی شہر مرغدین کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں کوئی کسی کا استحصال نہیں کرتا اور نہ جہاں پولیس اور فوج کی احتیاج ہے۔

اقبال کے تخیل نے ایک ایسے ہی معاشرے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اب اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا جہاں تک تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادیت کے اس خطرناک دور میں، جہاں حیات انسانی میں بے چہرگی، نفسانفسی اور مادیت کا دور دورہ ہے، لوگوں کو بار بار یہ عذر پیش کرتے ہوئے سنا اور دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے اس کاروبارِ شوق میں دین کی پابندی کہاں ممکن ہو سکتی ہے۔ یہ بے دینی کا رویہ روشن ضمیر اور اہل ایمان کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ دین مصطفیٰؐ کے قیامت تک زندہ و پائندہ رہنے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن انسان، حضرت انسان، جو مسجود ملائک ہے، اشرف المخلوقات ہے، اور جس کی تخلیق نیابت

الٰہی کے مقصد کے تحت عمل میں لائی گئی ہے، اپنی عاقبت کس طرح سنوار پائے گا۔ ایک دور وہ بھی گزرا ہے جب مسلمان قرآن کو سینے سے لگا کر اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ذرا بھی چوں و چرا نہیں کرتے تھے، وہ عروج پا کر سربلند ہو گئے، اور تا قیامت ان کے اعمال صالحہ انسان کے قلوب کو فرحت بخشتے رہیں گے۔ اس دور کے اہل ایمان نے قرآن کے فرمودات پر کاربند ہو کر نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دیا تو پھر اس دور میں دوبارہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر اب بھی قرآن کی پیروی کرنے کی ٹھان لی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سربلند نہ ہوں، اور بنی نوع انسان کے مسائل کا حل نہ نکل آئے۔ آئین کی پابندی کئے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور ممکن ہی نہیں۔ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے دنیا رک نہیں سکتی اور نہ کبھی رکے گی۔ ہم ہی وہ مسلمان ہیں جن کی طبیعت پر قرآنی احکامات کی پابندی گراں گزرتی ہے۔ اتنا ہی نہیں ہم اپنے وقتی اور حقیر مفادات کی خاطر خود کو بدلنے کے بجائے قرآن کو بدل دینے کا گناہ عظیم کرتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ایسے ہی منفی اور غلط اعمال کے پیش نظر اقبال قرآن کو ایک مظلوم صحیفہ قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ قرآن کے احکامات کو اپنے اوپر جبر محسوس نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اسے ذہنی اور فکری اعتبار سے اپنی زندگی کو ہم آہنگ کر دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''قرآن ان کے (یعنی مسلمانوں کے) حق میں ایک تلخ اور شافی دوا نہ رہے بلکہ ایک لذیز اور حیات بخش دوا بن جائے۔ منشائے ایزدی اور فطرتِ انسانی میں مغائرت نہ رہے بلکہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہو جائیں۔''

خوشبو کی کمی تھی غور کے قابل قتیلؔ ورنہ گلشن میں کوئی گل مرجھایا نہ تھا

اقبال بارگاہِ رسالتؐ میں

صاحبِ معراج، باعث کن فکان، فخرِ موجودات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت شریف سے قبل نوعِ انسان صدہا برس سے پستی اور گراوٹ کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ انسان کو ملوکیت اور پیشوائیت کے ہاتھوں صیدِ زبوں بنایا جاچکا تھا۔ قیصر و کسریٰ نے اپنی سطوت کے بل پر مخلوقِ خدا کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس غلامی کے سبب فطرتِ انسان پستی کا شکار ہو چکی تھی۔ انسانیت کی نے سے نکلنے والے نغمے خون آلود تھے۔ روئے زمین پر قعرِ مذلت میں گھری انسانیت کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ تھا، چنانچہ اجزائے ہستی کے پریشان ہو جانے کے بعد زمانہ ایک نئی شیرازہ بندی کا منتظر تھا۔ اپنی مخلوقات کی بے چارگی اور مظلومیت رب العالمین سے کب تک گوارا ہو سکتی تھی۔ بالآخر اُس کی رحمت جوش میں آئی اور جناب رحمت اللعالمینؐ کی بعثتِ شریف کے انوار سے ظلمت کافور ہو کر، نوعِ انسانی کو ہاتف کی طرف سے یہ مژدۂ جانفزا ملا

مبارک ہو کہ ختم المرسلینؐ تشریف لے آئے | جناب رحمت اللعالمین تشریف لے آئے
بصد اندازِ یکتائی بغایت شانِ زیبائی | امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

آپؐ نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں اپنے طرزِ عمل، اخلاق اور کردار کے ذریعے سے دنیا کے سامنے ایک ایسا نمونہ پیش کیا جس کی دوسری مثال انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپؐ نے اسلام کی اشاعت اور ترویج و ترقی کیلئے اپنی پوری حیات وقف کر دی۔ خاتم النبیینؐ کے وصال کے بعد اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود آپؐ کا اثر آج بھی اُسی طرح قائم و دائم ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ کائناتِ انسانی کی تاریخ میں عظمت کی حامل نامور اور تاریخی کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات کی فہرست میں آپؐ کا نامِ گرامی تاابد فضیلت کا حامل رہے گا۔

آپؐ کی عظمت کے پیش نظر سیرت النبیؐ پر دنیا کی مختلف زبانوں پر آج تک ایک وافر ذخیرہ معرضِ وجود میں آچکا ہے۔ مسلمان تو در کنار غیر مسلم بھی آپؐ کی سیرت طیبہ میں موجود بے شمار غیر معمولی

اوصاف کے پیش نظر آپ کی عظمت کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ مثال کے طور پر دورِ حاضر کے ایک غیر مسلم تاریخ دان اور محقق مائیکل ہارٹ نے اپنی معروف تصنیف "The 100, A Ranking of the Most Influential Persons in History" میں کائناتِ انسانی کی تاریخ میں عظیم نامور اور تاریخی کارہائے نمایاں کی حامل شخصیات کی فہرست میں جناب محمد عربیؐ کا اسم گرامی سب سے پہلے رکھا ہے۔ وہ اس کے اسباب میں دو بنیادی سبب یہ بتاتا ہے کہ آپؐ نے اشاعت اسلام اور اس کی ترویج و ترقی میں جو کچھ کیا، وہ حضرت عیسیٰؑ کی عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اُن کے نزدیک ذاتِ محمدؐ ہی وہ ذات اقدس ہے جو دنیوی اور مادّی، مذہبی و روحانی دونوں اعتبار سے سب سے زیادہ کامیاب رہی۔ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھنے والے محمدؐ نے نہ صرف دنیا کے ایک عظیم مذہب کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی اشاعت بھی کی اور وہ ایک انتہائی سحر انگیز سیاسی موثر رہنما بن گئے۔ مائیکل ہارٹ نے آپؐ کے وصال کے تیرہ سو سال سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی آج بھی آپؐ کے اثر کی پائیداری اور استحکام کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح عظیم جرمن شاعر اور مفکر وولف، گانگ، گوئٹے نے بھی آنحضورؐ کی شانِ پیغمبری اور آپؐ کو اپنے مشن میں حاصل ہوئی کامیابی سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اپنی نظم "Mohammat's Song"[1] میں زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت ہی عمدہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کا یہ حصہ بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

See the rock born stream
Like the gleam
of a star so bright
Kindly spirits
High above the clouds
Nourished him while youthful
in the copse between the cliffs.

قرآن مقدس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''انی جاعل فی الارض خلیفہ'' کے ذریعے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ ہونے کا اعزاز عطا کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی قرآن کے تناظر میں اپنی شاعری اور فکر کا محور فضیلت انسان کی تفسیر و تعبیر کو بنایا ہے۔ انسان کے نیابت الٰہی کے اعلیٰ اور ارفع منصب کا استحقاق اُس کے صفاتِ الٰہی کا مظہر بننے سے مشروط ہے۔ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے وہ صفاتِ

۱۔ علامہ اقبال نے گوئٹے کی اس نظم کا نہایت آزاد ترجمہ کیا ہے جو اُن کے فارسی مجموعۂ کلام ''پیام مشرق'' میں ''جوئے آب'' کے عنوان سے درج ہے۔

الٰہی کا مظہر بن کر انسان کامل بنتا ہے۔ اقبال کی شاعری اور فکر کی رُو سے انسان کامل کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ جناب محمد عربیؐ کی حیات طیبہ ہے۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ انسان کیلئے شمعِ ہدایت ہے۔ کلام اقبال کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ اپنے ارتقاً کے ہر دور میں شمعِ رسالتؐ کے اجالے میں ضوفشاں نظر آتا ہے۔ رسول مقبولؐ کی ذاتِ اقدس کے تئیں اقبال کے بے پناہ اور والہانہ عشق کا اظہار ان کی زندگی کے مختلف واقعات کے علاوہ ان کی فارسی اور اردو شاعری دونوں میں برابر ہوتا رہا ہے۔ اُن کے تخلیقی سفر میں شروع سے لیکر کے آخر تک ہر مجموعۂ کلام میں عشق کی یہ کارفرمائی مختلف رنگوں اور مختلف پیرایوں میں جلوہ گر ہے۔ ''بانگ درا'' کے حصہ اول (۱۹۰۵ء) میں مشمولہ نظم بعنوان ''بلالؓ'' میں حضرت بلالؓ کے عشق رسولؐ ہی کو خاص طور سے ملحوظِ نظر رکھا گیا ہے۔ نظم کے آخری شعر میں اس دور کو خوب قرار دیتے ہوئے اسے نہایت حسرت بھرے انداز میں یاد کیا گیا ہے جب وہ ذات پاکؐ یثرب یعنی مدینہ میں قیام پذیر تھی اور آپؐ کے دیدار سے ہر شخص مشرف ہوتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں جب علامہ یورپ سے لوٹے تو ان کی شاعری کا موضوع ملت اسلامیہ کے احوال وکوائف قرار پانے کی وجہ سے اس دور میں کہی گئی بعض نظمیں جناب محمد رسول اللہؐ کی محبت پر مشتمل ہیں۔ بعض ایسی نظمیں بھی نظر نواز ہوتی ہیں جو مزاج کے اعتبار سے روایتی نعتوں سے مماثل نظر آتی ہیں تاہم ان میں وہی مضامین پیش کیے گئے ہیں جو عام نعتوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں حضورؐ کے تئیں اقبال کے جذبۂ محبت کی سرشاری جابجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

حشر میں ابرِ شفاعت کا گہر بار آیا　　دیکھ اے جنس عمل تیرا خریدار آیا

اس نوع کی نعتوں میں محبت رسولؐ کی سرشاری نے تخاطب کا انداز اختیار کرلیا ہے اور جناب رحمت اللعالمین کو اپنی امیدوں کا آخری سہارا سمجھتے ہوئے آپؐ سے امت مسلمہ کے ہر دکھ درد کیلئے نسخۂ کیمیا عطا فرمانے کی پر درد اور پُر سوز درخواست کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ نعت ؎

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے　　یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

بانگِ درا کے حصۂ سوم (۱۹۰۸ء) کی ایک مختصر نظم ''حضور رسالت مآبؐ میں'' کے عنوان سے ہے جو اس زمانے میں لکھی گئی جب اٹلی نے طرابلس (موجودہ لیبیا) پر دھاوا بول دیا۔ اس حملے میں ترکوں، عربوں اور مصریوں نے متحد ہو کر اٹلی کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے اپنی غیرت وحمیت دینی کی خاطر غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ چنانچہ اقبال جیسے امت مسلمہ کے دردمندوں اور غیور مسلمانوں کیلئے یہ سانحہ ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے عالمِ خیال میں حضورؐ کی بارگاہ میں فرشتوں کی مدد سے پہنچ کر اس جنگ میں غیر معمولی قربانیاں

پیش کرنے والے شہداؓ کا مقدس لہو بطور نذرانہ پیش کیا۔ دنیا کی پستی سے اُٹھا کر فرشتوں نے شاعر کو اونچی پرواز کرانا سکھلا دیا اور وہ باغ جہاں سے خوشبو کی مانند نکل کر بزمِ رسالت مآبؐ میں حاضری سے باریاب ہوا۔ جب حضورؐ نے استفسار فرمایا ؎ ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اس پر عاشق رسولؐ علامہ اقبال نے بارگاہ رسالت میں دنیا میں وفا کی نایابی کے نتیجے میں اس سے اپنی ناآسودگی اور بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے ایک آبگینہ نذرانے کے طور پر پیش کیا، جس کا اختصاص یہ ہے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

نظم ''صدیق'' میں ۹ھ میں جنگ یرموک کے موقعے پر پیش آئے واقعے کو نظم کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ نے صحابۂ کرام کو راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب فرمائی۔ آپؐ کا یہ ارشاد پاک حضرت عمرؓ کیلئے باعث فرطِ مسرت ہوا۔ اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم تھے۔ وہ اپنے مال و اسباب میں سے نصف حصہ حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ جب کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ (جنہیں حضورؐ کا یارِ غار ہونے کا بھی شرف حاصل رہا ہے) اپنا تمام تر اثاثہ لے آئے اور اسے حضورؐ کے قدموں میں رکھ دیا۔ راہِ حق میں دل کھول کر اس پیشکش پر آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ اپنے اہل و عیال کیلئے بھی کچھ چھوڑا ہے یا نہیں، اس پر صدیق اکبرؓ نے عرض کیا ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کیلئے ہے خدا کا رسولؐ بس

قرآن مقدس میں آیا ہے۔ ''قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ''۔ اور ایک حدیث کی رُو سے تم میں سے کوئی شخص ایمان کی لذت نہیں پا سکتا جب تک میں اس کے نزدیک والدین، اولاد اور دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ نظم ''شکوہ'' میں مسلمان خدا کو غیروں پر رحمت کی بارش کرتے دیکھ کر مسلمانوں کو نظر انداز کر دینے پر بارگاہِ ایزدی میں شکایت کے انبار لگا دیتا ہے۔ اس پر خدا اس کے افعال و اعمال کو آئینہ دکھا کر اُسے اپنا احتساب کرنے کیلئے کہتا ہے۔ خدا اس کے تمام امراض اور اسے درپیش پیچیدہ مسائل کا سبب یہ قرار دیتا ہے کہ وہ آئین رسول مختارؐ سے تارک ہو چکا ہے جب کہ امت مسلمہ کو تمام اقوام عالم کی قیادت کے شرف سے مشرف کئے جانے کی بشارت قرآن بہت عرصہ پہلے ان الفاظ میں دے چکا ہے۔ ''کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ ؎

جس طرح احمد مرسلؐ ہوئے نبیوں میں امام　　اُن کی امت بھی ہے دنیا میں امامِ اقوام

اقبال امت مسلمہ کے امراض کی نشاندہی کرنے کے بعد اُسے دوبارہ سربلند ہونے کی خاطر نسخۂ کیمیا بھی

فراہم کرتے ہیں۔ عشق کی قوت کی بدولت مسلمان کو ذرہ سے بیابان ہونے اور پستی کو بلندی میں بدل دینے کا پیغام یوں دیتے ہیں ؎

مثالِ بو قید ہے غنچے میں پریشان ہو جا — رخت بردوش، ہوائے چمنستان ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا — نغمہ موج سے ہنگامۂ طوفان ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اپنے دین سے برگشتہ مسلمان کو اقبال دوبارہ اپنے مرکز پر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ صاحب یثربؐ کے شعار کا لحاظ نہ کرنے اور اس طرح اپنی شناخت کو کھو دینے پر اقبال کا دل پسیجتا رہا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک اس کے دوبارہ سربلند ہونے کیلئے جناب رحمت للعالمین کا مطیع بن جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ اطاعت رسولؐ کے نتیجے میں نہ صرف خدا کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے بلکہ مطیع رسولؐ بننے کے نتیجے میں مسلمان کو صاحب لوح و قلم کے شرف سے بھی نوازے جانے کا خود خدائے ذوالجلال نے وعدہ فرمایا ہے۔ بارگاہِ رسالتؐ میں اقبال مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ایک ایسی منزل پر جا پہنچتے ہیں جہاں کائنات کی ہر شئے میں انہیں عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ بڑے ہی تیقن کے ساتھ دنیا میں ہر سو عشق کی کارفرمائی کا یوں اعلان کرتے ہیں ؎

عشق دم جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰؐ — عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

اقبال قلب مسلمان کو جناب رسول اکرمؐ کا مقام و مسکن قرار دیتے ہوئے اسی اسم گرامی کی بدولت اس کی آبرو کا اعلان کرتے ہیں، چنانچہ دین تک حقیقی معنوں میں رسائی حاصل کرنے کیلئے جناب محمد مصطفےٰؐ تک رسائی حاصل کرنے کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ اس دور میں کہی گئی علامہ کی نظمیں حکمت دینی کا خلاصہ ہیں۔ ان نظموں میں اسرار حیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ان میں عشق رسولؐ کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ حکمت و فلسفہ سے معمور ہونے کے علاوہ ہمہ شوق و جذب و مستی سے عبارت ہے۔ ''بال جبرئیل'' کی معروف و مقبول نظم ''ذوق و شوق'' کا وہ بند اس کی نمائندہ مثال ہے۔ جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبد آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب

یہ نظم دراصل حضرت رسول اکرمؐ کے عشق میں کہی گئی ہے۔ مذکورہ بند میں اقبال اپنے محبوب حقیقی سے براہِ راست مخاطب ہوئے ہیں۔ زمانے کو کشمکش اور انتشار میں مبتلا دیکھ کر وہ آپؐ کے نگاہِ ناز کے اشاروں کے منتظر ہیں، ایک ایسی دنیا میں کہ دیدۂ امکان اپنے نور سے محروم ہو گیا ہے اور اقوام عالم میں شورش برپا ہے۔ اقبال ایک مردِ منتظر کو، جو اقوام عالم کیلئے رحمت بن کر آنے والا ہے، آواز دیتے ہیں۔ اس مردِ منتظر کو جس

نے رسول مقبولؐ کے اسوہ حسنہ کو اپنا شعار بنالیا ہے، مستقبل کے اسی انسان کو علامہ یوں پکارتے ہیں ؎

اے سوارِ اشہب دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکان بیا

رونق ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویان را بدہ پیغامِ صلح

نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

اقبال نے اپنی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کے ایک عنوان 'در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد' (یعنی اس بیان میں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے) میں خودی کو مستحکم کرنے کیلئے جناب رسول محترمؐ کی ذات اقدس کے تئیں عشق کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اس عشق کے فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کی ترویج و ترقی کی خاطر آپؐ کی کوششوں پر مشتمل اشعار بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎ در شبستان حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید (یعنی آپؐ نے شبستان حرا میں خلوت اختیار کی اور ایک نئی ملت، نیا آئین اور ایک نئے انداز کی حکومت وجود میں لائے)۔

ماند شبہا چشم اُو محروم نوم تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

(آپؐ نے اکثر راتیں بے خوابی میں گذار دیں۔ تب کہیں جا کر کے آپؐ کی امت نے تخت خسروی پر آرام کیا)

از کلید دیں، درِ دنیا کشاد ہمچو او بطن امِ گیتی نژاد

(آپ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ زمانے کے بطن سے آپؐ جیسا کوئی اور پیدا نہ ہوا)

اسرارِ خودی کے دوسرے حصے ''رموزِ بے خودی'' میں ملت کی خودی پر زور دیتے ہوئے ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی یعنی توحید اور رسالت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رسالت کا مقصود بنی آدم کی حریت، مساوات اور اخوت کی تشکیل و تاسیس ہے۔ اسی عنوان کے تحت آنے والے اشعار میں آپؐ کی بعثتِ شریف کے مقصد کی تکمیل میں نوع انسان کی فلاح و نجات کی خاطر آپؐ کی کوششوں کو گنواتے ہوئے امت خیر الانامؐ کے مخصوص خصائص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے امتیازات کو نا قابل برداشت قرار دیا گیا ہے کیونکہ ؎ در نہادا و مساوات آمدہ (یعنی اس کی نہاد میں مساوات رچی ہوئی ہے)

اس سلسلہ میں حریت اسلامیہ، اخوت اسلامیہ اور مساوات اسلامیہ کی توضیح کیلئے حکایات درج کرتے ہوئے سطوت آئین پیغمبری کی حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے۔ جناب سلطانِ دینؐ نے وطن سے ہجرت فرما کر قومیت مسلم کا عقدہ حل فرمایا۔ آپؐ کی حکمت نے کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک عالمگیر ملت کی بنیاد رکھی۔ اسی سبب کے تحت آپؐ کی کرم نوازی سے تمام تر روئے زمین ہمارے لئے مسجد بنادی گئی۔ ہجرت کو مسلمان کی حیات کا آئین بتاتے ہوئے آفتاب کی شان اس کی نسبت مکانی سے آزاد ہونے میں بتائی گئی ہے تاکہ سارے آفاق کی پہنائی اس کے زیر پا ہو۔ چنانچہ اسے مچھلی کی مانند سمندر میں آباد رہنے اور قید مقام سے آزاد ہونے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثنوی میں دورِ حاضر کے مسلمانوں کے انحطاط و زوال کی صورتحال کے پیش نظر اقبال انہیں دوبارہ سربلند دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اس سلسلے میں حضور پرنورؐ کی حیات طیبہ سے چند واقعات کا حوالہ ایک حقیقی عاشق رسولؐ اور کامیاب شاعر کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت کا حسنِ سیرت جناب محمد رسول اللہؐ کے آداب اختیار کرنے میں ہے۔ جود و سخا حضورؐ کی سیرت پاک کے غیر معمولی اوصاف میں سے ہے۔ کسی سائل کی احتیاج کو اپنی احتیاج پر ترجیح دینے والے ہمارے پیارے نبیؐ کے اس وصف کا قیاس تک ہمارے لئے ممکن نہیں۔ آپؐ سائل کی حاجت روائی کیلئے قرض بھی لے لیتے۔ راہِ خدا میں دینے والا آپؐ جیسا بطن گیتی پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔ آپؐ کے آداب اختیار کرنے اور آپؐ کی اتباع کرنے کی ترغیب میں علامہ کے صوفی منش والد بزرگوار شیخ نور محمد کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ جوانی کے زمانے میں انسان بالعموم خیر و شر کی تمیز سے بہرہ مند نہیں ہوتا۔ چنانچہ علامہ اقبال بھی اپنے دور شباب میں اس چیز سے کچھ مستثنیٰ نہ تھے۔ ایک روز ایک سائل کو اپنے گھر کے دروازے پر حاجت روائی کی خاطر بضد ہوتے دیکھ کر اپنے والد کے سامنے غصہ کی حالت میں اس کے سر پر ڈنڈا دے مارا، جس کے نتیجے میں اس کی جھولی میں جمع ساری بھیک نیچے گر گئی۔ اپنے بیٹے کے اس غیر انسانی فعل کا مشاہدہ کرتے ہوئے علامہ کے خدا ترس والد نہ صرف آزردہ خاطر ہوئے بلکہ روز حشر کو اپنے محبوب حقیقی کے سامنے اس کے مواخذہ کے تصور سے خائف ہو کر ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس پر اپنے بیٹے اقبال کو بادِ بہار مصطفیٰؐ سے شگفتہ ہو کر پھول بن جانے کی یوں نصیحت کی

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن　　پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

(اپنے باپ پر یہ نازیبا ظلم نہ کر۔ اس غلام کو اپنے آقاؐ کے حضور رسوا نہ کر)

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ　　گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ

(تو حضور اکرمؐ کی شاخسار کا ایک غنچہ ہے۔ بادِ بہار مصطفیٰ سے کھل کر پھول بن جا)

از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرہ از خُلق او باید گرفت

(تجھے آپ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہیے۔ تجھے آپؐ کے خلق عظیم سے حصہ لینا چاہیے)

مرشدِ رُومی چہ خوش فرمودہ است　　آنکہ یم، در قطرہ اش، آسودہ است

(مرشد رومی نے کیا خوب کہا ہے۔ اس کے کلام کے ہر قطرے میں سمندر سمویا ہوا ہے)

جوانی کے ایام میں پیش آئے مذکورہ واقعے کو علامہ نے ۱۹۱۸ء میں منصۂ شہود پر آئی فارسی مثنوی ''موز بے خودی'' میں نظم کیا۔ شعار پاسِ صاحب یثربؐ اور اس ذات اقدس کے تئیں ان کا عشق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قدر مستحکم اور گہرا ہوتا گیا کہ آپؐ کا اسم گرامی سنتے ہی ان پر رقت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ شہر مدینہ کو عزیز تر رکھنے اور یہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ آنجا دلبر است۔

مسکن یار است و شہرِ شاہِ من　　پیشِ عاشق، ایں بود حب الوطن

اپنے دل کو حضور اقدسؐ اور آپؐ کی یاد کا مسکن بنانے اور آپؐ کی دیوار کے سائے میں مرقد نصیب ہونے کی دیرینہ آرزو اقبال کے دل میں سدا انگڑائیاں لیتی رہی۔ یہاں تک کہ اپنی حیات مستعار کے آخری برسوں میں تھوڑی بہت قوت کو بچا بچا کر رکھنے کا اظہار انہوں نے اپنے ایک دوست کے نام تحریر کئے گئے مکتوب میں بھی کیا ہے تا کہ روضۂ اطہر پر حاضری دی جا سکے۔ قلبی سکون عطا کرنے والی اس آرزو کی تکمیل کو اقبال اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں لیکن مشیت ایزدی کے سامنے انسان کے بے بس ہونے کے سبب روضۂ اطہر پر حاضری دینے کا علامہ کی زندگی کا دیرینہ خواب یا آرزو گرچہ ظاہر کی آنکھ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تاہم چشمِ باطن کی وساطت سے انہوں نے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کر کے محبوب حقیقی کے عشق میں اپنے دل فگار کی سیمیائی کیفیات کا حال بارگاہِ رسالت مآبؐ میں اپنے آخری مجموعۂ کلام ''ارمغان حجاز'' کی صورت میں ضرور عرض کیا ہے۔ سوزِ فراق کو مہمیز عطا کرنے والے ذوق و شوق سے معمور اس پر سعادت سفر کو اقبال سارباں سے کتنا ہی طویل بنانے کا خواہاں ہو کیونکہ شوق بمیرد ز وصل کی بجائے حیات دوام کے حصول کی خاطر سوختن ناتمام کے آرزومند اقبال جیسے شوق کے سچے راہی بالآخر اپنی منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ بارگاہِ رسالت مآبؐ میں باریابی حاصل کرنے پر بھی علامہ کو امت مسلمہ کے دوبارہ سربلند ہونے کی فکر دامنگیر ہے۔ یہاں وہ مسلمانوں، بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ ان کی محکومی اپنے آئین سے برگشتگی، غیر اسلامی شعائر اختیار کرنے اور عشقِ مصطفیٰؐ سے ان کے دل خالی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ کونینؐ سے انہیں از سر نو اپنے اصل مقام سے، جسے انہوں نے اپنے منفی اعمال کی بدولت کھو دیا ہے، سرفراز فرمانے کی درخواست کرتے ہیں۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ

مسلمانوں نے ان کے پیغام کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے انہیں محض ایک شاعر گردانا۔ چنانچہ امت مسلمہ کے سامنے اسرارِ جان مزید وضاحت کے ساتھ اور کھل کر بیان کرنے کی خاطر وہ جناب رسالت مآبؐ سے اپنے لئے اہل عرب جیسی قوت گویائی عطا کرنے کی التجا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مرکز سے کوسوں دور دیکھ کر انہیں اپنا اصل مقام واپس مل جانے کی فکر میں مستغرق رہنا اقبال کا معمول رہا ہے۔ چنانچہ ایک رات، جب حضورِ حق میں مسلمانوں کے خوار و زبوں ہونے پر سیلِ اشک بہا کر اس کا بنیادی سبب دریافت کرنا چاہا تو انہیں جو ندا سنائی دی وہ اپنے محور و مرکز سے دور برگشتہ مسلمانوں کو سدا دعوت فکر دیتی رہے گی ؎

دلے دارند و محبوبے نہ دارند

اپنے آخری مجموعۂ کلام فارسی ''ارمغان حجاز'' کے عنوان ''حضورِ ملت'' کے تحت اقبال نے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے دل لگانے اور حضور اکرمؐ کی اتباع کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ آپؐ کی غلامی کی بدولت کائنات کی تسخیر عین ممکن ہے ؎

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراکِ صاحبِ دولت بستم سرِ خود را

فکرِ اقبال میں رسولِ مقبولؐ کا مقام

مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام　　شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

سیرت النبیؐ کے تمام روشن اور تابندہ پہلوؤں کے پیشِ نظر اس محسنِ کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبے کا احاطہ کرنے کا یارانہ قلم کو ہے اور نہ زبان کو، جس کی تعریف و توصیف اور عظمت کا بیان خود خدائے قدوس و جبروت نے قرآن مقدس میں فرمایا ہے۔ بڑے بڑے نعت گو شعراء بہت کچھ کہنے کے بعد اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے ثنائے خواجہؐ کو خدا کے سپرد کر چکے ہیں۔ بقول مرزا اسداللہ خان غالبؔ

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم　　کآں ذات پاک، مرتبہ دانِ محمدؐ ست

(غالبؔ میں نے حضورؐ کی نعت یا حضورؐ کی تعریف و توصیف خدا پر چھوڑ دی ہے کیوں کہ وہی ذاتِ پاک آپ کی مرتبہ داں ہے)

زیرِ نظر مقالے میں موضوع ''فکرِ اقبال میں رسولِ مقبولؐ کا مقام'' کے حوالے سے چند خیالات کا اظہار کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ فضیلتِ آدم اور اس کی حریت کو اقبال کے نظامِ فکر میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ بنیادی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر اقبال زماں و مکاں، رنگ و نسل اور زبان وغیرہ کی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر آفاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی پہلی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ۱۹۱۵ء[1] میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آئی۔ اس مثنوی کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا انگریزی میں ترجمہ مشہور مستشرق آر۔ اے۔ نکلسنؔ نے کیا۔ اس مثنوی نے جہاں مشرق کے صوفیانہ حلقوں میں برہمی پیدا کر دی وہاں بین الاقوامی سطح پر بھی اس پر کئی اعتراضات کیے گئے۔ ڈکنسنؔ نے اس مثنوی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ اس مثنوی میں اقبال نے اسلام کو propagate کیا ہے، چنانچہ مذکورہ مثنوی کو مسلمانوں تک محدود کرتے ہوئے اسے آفاقیت سے عاری قرار دیا گیا۔ اس پر اقبال نے اپنے موقف یا حقیقتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"The object of my Persian mathnavi is not to attempt an

advocay of Islam. My real purpose is to seek a better social order and to present to the world a universally acceptable ideal (of life and action) but it is impossible for me, to ignore the social system and values of Islam whose most important objective is to demolish all artificial and pernicious distinctions of caste, creed, colour and economic status. Islam is violently opposed to the idea of racial superiority, which is the greatest obstacle in the way of international unity and co-operation. In fact, Islam and racial exclusiveness are absolutely antithetic."

فارسی مثنویوں کی تصنیف سے اقبال کا مدعا و مقصد اسلام کی وکالت کرنا نہ تھا بلکہ وہ ایک ایسے جدید معاشرے کی تلاش میں تھے جو نوعِ انسان کو ذات پات، رنگ و نسل، مرتبہ و درجہ اور جغرافیہ کے تمام تر امتیازات سے آزاد کر دے، یہ تمام تر خوبیاں صرف اور صرف اسلام میں موجود ہیں۔ اسلام انسان میں ضبطِ نفس اور دنیاوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اسلام کا نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے جدا کوئی چیز نہیں، یہ معاشرتی نظام خود اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ دونوں اقبال کی نظر میں لازم و ملزوم ہیں۔ اقبال یورپ کو اس دولتِ بے بہا سے محروم قرار دیکر اسے یعنی یورپ کو اس متاعِ بے بہا سے فیضیاب ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ نسلی برتری کو انسانیت اور عالمی امن و اتحاد کے راستے میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہوئے مقام آدم کو گردوں سے بھی برتر اور احترامِ آدم کو تہذیب کی اصل قرار دینے والا اسلام کا داعی اور عظمتِ انسان کا یہ حدی خواں جب عالمی سطح پر سامراجیت، فسطائیت، اشتراکیت، ملوکیت، مغربی جمہوریت وغیرہ وغیرہ کی آڑ میں فضیلت انسان اور حریت انسان کی دھجیاں اڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو اشرف المخلوقات کے پارہ پارہ ہو کر اس کے پامال ہونے پر انسانیت کے اس پرسوز اور دردمند مفکر شاعر کا دل پسیجتا ہے اور وہ ان کارفرما آدم کش عوامل پر اپنے ردِّ عمل کا شدت سے اظہار کرتے ہوئے نوعِ انسان کو اخوت و محبت کا پیغام دیتے ہیں ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

نوعِ انسان پہ روا رکھے جا رہے سفاکانہ عوامل اور اس پر مختلف طرح کے مظالم ڈھائے جانے کے حوالے

سے اقبال کی شاعری اور نثری تحریریں بھری پڑی ہیں۔ انسانیت کش حربوں اور عوامل کی ڈھیل دینے والے نام نہاد مدبّر قائدین اور حاکموں کی ملوکانہ اور استعماری سازشوں اور مصلحت کوشیوں پر انسان دوستی اور احترامِ آدمیت کے جذبے سے سرشار مفکر شاعر علامہ اقبال نے اپنے شدید ردعمل کا اظہار اُس پیغام میں واشگاف الفاظ میں کیا ہے جو انہوں نے سالِ نو کے موقعے پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو لاہور کو دیا تھا: انہوں نے کہا تھا:

''جن نام نہاد مدبّروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے، وہ خونریزی، سفاکی، زیرِ دست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسانوں کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور علمی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس واسطے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے احوال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خونریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا، تاکہ وہ غلامی کی افیوں سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔''

انسان کے ہاتھوں انسان کی پامالی، زیردستی اور زبوں حالی کی ایک خاصی طویل داستان ہے۔ یہ نہ صرف آج کے دور سے مخصوص ہے بلکہ اسلام سے قبل عرب میں زمانۂ جاہلیت کی اگر بات کریں تو اس میں بھی انسان ظلم و استبداد کا بری طرح شکار تھا۔ اس کی حیثیت ایک غلام کی سی تھی۔ اپنی محنت و مشقت کی کمائی کا بیشتر حصہ اسے اپنے آقاؤں کی خدمت میں باج کے طور پر دینا پڑتا تھا۔ اس طرح ملوکیت و پیشوائیت کے ہاتھوں اسے صیدِ زبوں بنایا گیا تھا لیکن ظلم کا حد سے گزرنا ظلم کا خاتمہ ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان پر رحم فرما کر آقائے دو جہاں کو رہتی دنیا تک رحمت اللعالمینؐ بنا کر مبعوث فرمایا۔ کسی شاعر نے بجا کہا ہے۔

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اِک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا — اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

آپؐ زندگی بھر اپنے فکر و عمل سے بندۂ مومن کا ثبوت دیتے رہے۔ چالیس برس کی عمر میں آپؐ کو نبوت

سے سرفراز فرمایا گیا۔ آپؐ پر قرآن نازل کیا گیا۔ آپؐ حرا سے اُتر کر سوئے قوم آئے اور اپنے ہمراہ نسخۂ کیمیا لے آئے۔ قرآن کی تعلیمات کو عام کرتے ہوئے اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے آپؐ دن رات بلکہ ۲۳ سال تک مسلسل کاوشیں کرتے رہے۔ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر دشمنانِ اسلام آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپؐ کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ آپؐ نے توحید کی اساس پر ایک ایسا برتر اور صالح معاشرہ قائم کیا جس کی نظیر پوری دنیا کی تاریخ میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ بقول مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ؎

کنش را بداں گونہ شیرازہ بست — بدیں صفحہ نقشِ چناں تازہ بست
کہ تا گردشِ چرخِ نیلوفری — بود سبز جائش بہ پیغمبری[۲]

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، حیاتِ انسانی مختلف اسباب کی بناء پر روبہ زوال ہوتی رہی اور یہ ایک ایسی انتہا کو پہنچ گئی جہاں تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانیت کے دلسوز علمبرداروں کو وقتاً فوقتاً مسلم نشاۃ ثانیہ کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال بھی ایک مسلم دانشور کی حیثیت سے عالمی سطح پر وقوع پذیر اس دردناک صورت حال کا نہایت گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہے۔ ملت اسلامیہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہوئے وہ اس کا حل قرآن و سنت اور حکمت بالغہ کی روشنی میں تلاش کرتے رہے۔ عالمِ انسانیت کی بالعموم اور ملت اسلامیہ کی بالخصوص ناگفتہ بہ حالت کا مشاہدہ کر کے وہ راتوں کو رویا کرتے۔ موخر الذکر کو حیاتِ تازہ سے ہمکنار کرنے کے وہ شدید آرزومند تھے۔ اُنہیں اس بات پر پختہ یقین تھا کہ جناب ختم المرسلینؐ کی امت خاتم الامم ہے، جس پر بھاری سماجی، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ساقی گری کی خدمت اسی امت کے سپرد کی گئی ہے۔ چنانچہ امتِ محمدیہؐ کو اس کے رول یا کردار کا احساس دلاتے ہوئے اُسے اس خدمت کی انجام دہی کا پیغام یوں دیتے ہیں۔

ہو چکا قوم کی شانِ جلالی کا ظہور — ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اس شان جمالی کے ظہور کے لئے اقبال خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر امت مسلمہ سے قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی رہ رہ کر تلقین کرتے ہیں۔ اس سے اقبال کا مقصود دوبارہ اسی برتر اور صالح معاشرے بلکہ بہتر نظام حیات کا احیاء ہے جس کی تعمیر و تشکیل جناب آنحضورؐ نے فرمائی تھی۔

اقبال نے اپنی پہلی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' میں فرد اور معاشرے یا فرد اور ملت کے ربط باہمی کے نتیجے میں عمل میں آنے والے برتر اور صالح معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ ''رموزِ بے خودی'' میں توحید کے بعد رسالت مآبؐ کی مرکزی حیثیت بیان کرتے ہوئے مقامِ رسالتؐ کی

وضاحت کی ہے۔ رسالت محمدیہؐ کا مقصد حریتِ انسان کی تشکیل و تاسیس، اخوت و مساوات ہے۔ آپؐ نے توحید کی بنیاد پر اپنی ۲۳ سالہ شب و روز کی مسلسل کاوشوں کی بدولت انسان کی حریت، اخوت و مساوات پر مبنی ایک بے مثال معاشرہ قائم کیا۔ آپؐ کی رسالت کا مقصد کسی ایسے گروہ یا جماعت کی تعمیر نہ تھا جس میں اپنے ملک و قوم کی فضیلت کا سکہ بٹھانا مطلوب تھا بلکہ آپؐ نے قید مقام سے آزاد ہو کر اپنی ذات اور پیغام کو کسی خاص ملک، وطن یا خطۂ زمین تک محدود و مخصوص نہیں رکھا بلکہ آپؐ کی کرم نوازی روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات پر مساوی ہے۔ روئے زمین آپؐ کے نزدیک مسجد کا درجہ رکھتی ہے۔ آپؐ نے انسانوں کو انسانوں پر رحم کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ مخلوقِ خدا پر رحم سے عاری شخص کیونکر خدا سے رحم کی توقع کر سکتا ہے۔

حضور پرنورؐ مقصد کائنات ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپؐ کی خاطر اس وسیع و عریض کائنات کی تخلیق فرمائی۔ آپؐ نہ ہوتے تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی۔ تاج کسریٰ آپؐ کے زیر پا تھا۔ شہ کونین ہو کر آپؐ بوریا نشین رہے۔ دنیا و جاہ پرستی سے آپؐ دور رہ کر اپنی تمام تر حیات طیبہ احکام خداوندی کی پابندی اور کرۂ ارض پر حق کا بول بالا قائم کرنے میں بسر کرتے رہے اور بندگانِ خدا کے لئے اس کا عملی نمونہ پیش کرتے رہے۔

آپؐ کا دین وطنیت کا پابند نہیں۔ علامہ اقبال نے آپؐ کی حیات طیبہ سے مختلف واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے آپؐ کے مقام و مرتبے کے چند پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ طوالت سے بچتے ہوئے یہاں فقط ایک واقعہ درج کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ آنحضورؐ نے جب دین اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو آپؐ کے ہم وطن اور ہم عصر کعب بن زہیرؓ دشمنانِ اسلام میں شامل ہو کر آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے، لیکن آپؐ کے حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار سے متاثر ہو کر وہ ایمان لے آئے اور آپؐ کی مدح میں ایک پرتاثیر قصیدہ لکھ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی کی درخواست کی۔ فتح مکہ کے بعد اپنے تمام دشمنوں کا بدلہ لینے کے بجائے انہیں لاتثریب علیکم یعنی آپ پر کوئی سرزنش نہیں، کا مژدہ جان فزا سنانے والے ہمارے پیارے نبیؐ نے حضرت زہیرؓ کی خطاؤں کو بھی درگزر فرمایا۔ حضرت کعب بن زہیرؓ نے آپؐ کو قصیدہ میں من سیوف الہند یعنی ہند کی تلواروں میں سے ایک تلوار کا خطاب دیا تھا، اس خطاب کے ذریعے آپؐ کی ذات فقط ہند سے وابستہ ہو جاتی تھی، چنانچہ اس پر آپؐ نے اصلاح دیتے ہوئے من سیوف اللہ یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کہنے کا مشورہ دیا۔ کعب بن زہیرؓ کے قصیدے پر دی گئی اس اصلاح سے ایک اہم نکتے کی جانب توجہ مبذول ہوتی ہے کہ آنحضورؐ اپنی ذات کو کسی خاص مقام، ملک یا خطۂ وطن سے وابستہ نہیں کرتے تھے، اس لئے مذکورہ واقعے کو نظم کرتے ہوئے اقبال مسلمانوں سے بھی اپنے آپ کو کسی ایک ملک سے وابستہ نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ مسلمان کسی

خاص وطن میں نہیں سماتا، بلکہ تمام ممالک اس کے اندر گم ہو جاتے ہیں

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم　　در دل اُو یا وہ گردد شام و روم[۳]

علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کے انحطاط و زوال کے پیش نظر مسلمانانِ عالم کے تمام عوارض کا علاج کرنے کیلئے فلسفۂ خودی پیش کیا جسے ان کے نظامِ فکر میں محور و مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے اور اسے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کیلئے علامہ نے تین مراحل (۱) اطاعت (۲) ضبطِ نفس اور (۳) نیابت الٰہی تجویز کئے ہیں۔ خودی کو جس چیز سے استحکام عطا کیا جا سکتا ہے، وہ عشقِ رسولؐ ہے۔ عشقِ رسول زبانی جمع خرچی کا نام نہیں بلکہ مسلمان آپؐ کو اپنے والدین، اپنی اولاد، اپنی جان اور تمام جہاں سے عزیز تر رکھے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی میں شمع راہ بنائے۔ "ان المحب لمن یحب مطیع"۔ اتباعِ رسولؐ کے بغیر عشقِ رسولؐ کا اقتضاء پورا ہو ہی نہیں سکتا۔

اقبال مسلمانوں کے باہمی انتشار اور افتراق سے خاصے پریشاں ہو کر ملت اسلامیہ کو یک جا کرنے اور نیل کے ساحل سے لیکر کے تابہ خاک کاشغر اسے ایک لڑی میں پرونے کے لئے عشقِ رسولؐ کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آقائے دو جہاںؐ سے رشتہ استوار کر کے اور آپؐ کی کامل اتباع کی بدولت نہ صرف ان کی شیرازہ بندی ممکن ہے بلکہ ان کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کا کفیل اور نیابت الٰہی کے منصب رفیع پر فائز ہونے کی سبیل بھی عشقِ رسولؐ ہی ہے

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو شود یزداں شکار

مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصہ رموزِ بے خودی کا آخری عنوان "عرض حال مصنف بحضور رحمت اللعالمینؐ" جناب آنحضورؐ کے رفیع الشان مقام و مرتبے کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ اس عنوان کے تحت آپؐ کو خوابِ زندگی کی تعبیر قرار دیا گیا ہے۔ یہ آپؐ ہی کی ذات اقدس ہے جس کے طفیل کرۂ ارض کو شرف نصیب ہوا۔ آپؐ کا فقر متاعِ کائنات ہے۔ آپؐ کے اعلیٰ و بالا مقام و مرتبے کے پیش نظر کائنات کا ذرہ ذرہ آپؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ منکرین خدا تک آپؐ کی شان اور عظمت کے قائل ہیں۔ اقبال عشقِ رسولؐ سے سرشار ہو کر آپؐ کے مسکن کی دیوار کے سائے میں مرقد نصیب ہو جانے کے کس قدر متمنی ہیں، ملاحظہ کیجئے

فرخا شہرے کہ تو بودی درآں　　اے خنک خاکے کہ آسودی درآں

"مسکن یار است و شہرِ شاہِ من　　پیش عاشق ایں بود حب الوطن"

کو کہم را دیدۂ بیدار بخش　　مرقدے در سایۂ دیوار بخش

عشقِ رسولؐ کا عملی پہلو اساسی اہمیت کا حامل ہے، جس سے ذرہ خاک ہم دوشِ ثریا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آج کے پرآشوب، ہیجان خیز اور پرتناؤ دور میں اسے اختیار کرنا انتہائی ناگزیر ہے۔ دورِ حاضر میں انسان جس قدر سرعت کے ساتھ ارتقاء کے مراحل سے گزر رہا ہے اسی قدر وہ انسانیت اور روحانیت سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ ستاروں پر کمند ڈالنے کے اہل تو ہو چکا ہے لیکن زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنے کا ہنر اور سلیقہ اسے ابھی تک نہ آیا۔

اقبال نے جس برتر اور صالح معاشرے کو از سرِ نو وقوع میں لانے کا خواب دیکھا تھا اسے بعض معترضین نے یوٹوپیا یا خیالی جنت کا نام دے دیا ہے۔ اس سلسلے میں بصد ادب عرض ہے کہ اسے یوٹوپیا یا خیالی جنت کہنا جب صحیح ہوتا جب یہ کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہوتا۔ اس کا نمایاں ثبوت دورِ خلافت راشدہ میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں ''وہ برتر اسلامی معاشرہ، جو وقوع میں آچکا ہے، یوٹوپیا نہ تھا۔ اب دنیا باور نہیں کرسکتی، مگر یہ ہوا کہ ایک آدمی عرب کے طول و عرض میں سونا اچھالتا نکل جاتا تھا اور اس سے کوئی تعرض نہ کرتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھوک اور ضرورت کا نام تک نہ تھا۔ لوگوں نے اپنی ضرورتوں کا مسئلہ اپنی رضا اور ضبطِ نفس سے حل کرلیا تھا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں ؎

نیم نانے گر خورد مردِ خدا — بزلِ درویشاں کند نیمے دگر

پر عامل تھے، جس میں غلام اور آقا برابر تھے۔ انہیں غلاموں نے جب بادشاہتیں قائم کیں تو ان کی اطاعت ہوئی، جس میں لوگوں نے ملک دوسروں کو بخش دیئے، جس میں بوریا نشینوں کو مسند نشینوں پر ترجیح تھی، جس میں خلفاء اپنے بیٹوں کو سرِ عام سزا دے سکتے تھے''۔[۴]

اور انسان کے مثبت اور صالح فکر و عمل کے نتیجے میں اس قسم کا معاشرہ دوبارہ وقوع میں آسکتا ہے۔

سیرت کی محافل کا انعقاد پہلے بھی کیا جاتا رہا ہے، آج بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان محفلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پہلے بھی خدا کے گھر میں اذان دی جاتی تھی اور وہ نمازیوں سے آباد رہتا تھا۔ آج بھی خانۂ خدا نمازیوں سے معمور نظر آتے ہیں، لیکن آج بندۂ مومن کی وہ اذان کہاں جس سے شبستان وجود لرزہ براندام ہوتا تھا۔ سیرت کی محفلوں کے انعقاد اور اہتمام کا ہم سب سے یہ اقتضاء ہے کہ ہم سیرتی محفلوں کے انعقاد، ان کی غرض و غایت اور ان کی روح کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کریں، تاکہ قرآن اور جادۂ رسولؐ سے برگشتہ، سود و زیاں کے چکر میں الجھا ہوا، مادیت کا پرستار، روحانیت سے بیگانہ، بھیڑ میں خود کو تنہا محسوس کرنے والا یہ حضرت انسان ہوش کے ناخن لیکر اپنے عمل کا احتساب کرے کہ کیا سبب ہے کہ فطرت نے ہمیں گردوں سے زمین پر دے مارا۔ اس کے لئے

اقبال کا یہ پیغام اسے دوبارہ اسی عظمت سے ہمکنار کر سکتا ہے جسے وہ اپنے منفی اور تخریبی اعمال کے نتیجے میں کھو چکا ہے۔

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا ‏ رخت بردوش ہوائے چمنستان ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا ‏ نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفان ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ‏ دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

فقط ایمان اور اعتقاد کے بل بوتے پر کسی قوم کا اس وقت تک بامِ عروج پر پہنچنا ممکن ہی نہیں جب تک ایمان اور اعتقاد کے لوازمات اور تقاضوں کی تکمیل نہ کی جائے۔

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است ‏ آب و تابش از یمِ پیغمبر است
آب نیسانی بآغوشش در آ ‏ وز میانِ قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو ‏ صاحبِ تابانیِ جاوید شو

حوالہ جات:

۱۔ اس مثنوی کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔
۲۔ عمل کی شیرازہ بندی اس طرح فرمائی اور روئے زمین پر ایسا نادر نقش قائم کیا کہ جب تک نیلا آسمان گردش میں ہے۔ آپ کی نبوّت کا سکہ جاری رہے گا۔
۳۔ درویشِ خدامست نہ شرقی نہ غربی است ‏ گھر مرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مسائل اقبال، ص ۳۵۸۔

نوعِ انسانی پر رسول اللہؐ کے احسانات

آں کہ از خاکش بروید آرزو ہر کجا بنی جہانِ رنگ و بو
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰیؐ [1] یاز نورِ مصطفٰیؐ اُو را بہاست

شانہ کر والیل مولیس صبح رولیس پرہ ٹل
یا رسول اللہؐ یے ڈچھی وُچھی بنان شام و سحر

رازدانِ جزوکل، شمعِ شبستانِ وجود، باعثِ کن فکان، صاحبِ معراج، پیغمبرِ آخرالزماں جناب محمد عربیؐ کو خدائے قدوس نے تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ وما ارسلنک الا رحمۃ اللعالمین۔ چنانچہ ''انسانی دنیا پر آپؐ کے احسانات'' کی تحدید کرنا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں۔ مشہور عرب شاعر کعب بن زہیر جن کا شمار پہلے دشمنانِ اسلام میں ہوتا تھا، محسنِ اعظم نے جب دینِ اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو حضرت کعب بن زہیرؓ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن آپؐ کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر ایمان لائے اور آپ کی مدح میں ایک پرتاثیر قصیدہ ''بانت سعاد'' لکھ کر آپ کی خدمت میں بطور ارمغان لے آئے۔ حضرت کعب بن زہیرؓ نے قصیدے میں آپ کو ''من سیوف الہند'' یعنی ہندوستان کی تلواروں میں ایک تلوار کا خطاب دیا تھا۔ اس پر قید مقام سے آزاد تمام عالمین کے رحمت والے نبیؐ نے اصلاح دیکر ''من سیوف اللہ'' یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کہنے کا کعب بن زہیر کو مشورہ دیا۔ اس واقعے میں ایک نکتہ یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی کسی خاص مقام، ملک، خطہ یا زمین سے وابستہ نہ تھی بلکہ عالم خداوند سے تھی۔ کائنات، جس میں نوعِ انسانی کے علاوہ خدا کی اور بھی لاتعداد مخلوقات ہیں، جو انسان کے مشاہدے میں نہیں آتیں، پر آپؐ کے احسانات کو گنوانے کا یارانہ تو نطق انسان کو ہے اور نہ ہی نوکِ قلم کو۔ اور انسان کی زبان اگر شمع کی مانند پگھل بھی جائے اور سمندروں کے پانیوں کو سیاہی کے طور پر استعمال

ا۔ جہاں کہیں تو جہان رنگ وبو کو دیکھتا ہے، ایسا جہان، جس کی خاک سے آرزو پھوٹتی ہو یا تو اس کی قدر و قیمت نورِ مصطفٰیؐ سے ہے، یا وہ ابھی تک مصطفٰیؐ کی تلاش میں ہے۔

کیا جائے، جب بھی اُس محسن اعظمؐ کی کرم نوازیوں اور رحمتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ رحمتِ ایزدی اور روزِ حشر کو شفیع المذنبین کی شفاعت کی برکت کی امیدِ واثق مسلمان کا واحد اور آخری سہارا ہے، اس لئے پوری دنیا پر آپؐ کے احسانات کا سرسری طور پر تذکرہ کرنا بھی باعثِ سعادت ہے۔ اس نازک ترین کام میں سانس بھی آہستہ سے لینے اور کمال احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی ہے ؎

باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

رُوئے زمین پر حضرت انسان کو نیابت الٰہی کا گرانبار فریضہ انجام دئے جانے کے پیش نظر ہی اُسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ اس کے اندر غیر معمولی استعداد اور لامحدود امکانات چھپے ہوئے ہیں جنہیں قانون الٰہی کے تابع رکھ کر اس دارالعمل میں سعی پیہم کے ذریعے بروئے کار لانے کی تلقین کی گئی ہے لیکن جب انسان خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی غیر معمولی قوتوں یا صلاحیتوں کو کسی طاغوت کے تابع کر دیتا ہے تو وہ اپنے عظیم شرف یعنی اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مقام سے اتنا نیچے گر جاتا ہے کہ اُس میں اور حیوان میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا۔ منفی اور تخریبی فکر و عمل کے نتیجے میں انسان طاغوتی قوتوں کا غلام بن جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے جس کے بے شمار ثبوت انسانی تاریخ کے مختلف ادوار پیش کر چکی ہے۔ نوعِ انسان کی زبوں حالی جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو نظام ہستی کو چلانے والی سب سے بڑی قوت کسی نہ کسی شخصیت کو مبعوث کرتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضورؐ سے قبل کئی انبیاء مبعوث کئے گئے۔ ہر پیغمبر کسی نہ کسی علاقے، قوم، آبادی، شہر یا قریہ کی طرف مبعوث کیا گیا اور وہی لوگ ان کے مخاطب ہوئے۔ گویا ان کی بعثت ایک مخصوص زمانے کے لئے ہوتی۔ اُن کے وصال کے بعد اگلی نسلوں کے لئے اور پیغمبرانِ گرامی مبعوث کر دئے گئے لیکن خاتم النبیینؐ کی بعثت کا دائرۂ کار غیر معمولی وسعت کا حامل ہے۔ آپؐ کی ولادتِ باسعادت جب ہوئی تو پوری دنیا بالخصوص عرب میں طرح طرح کی برائیاں عام تھیں۔ فسق و فجور کا ہر سُو دور دورہ تھا۔ ذات پات، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود و قیود کی بناء پر انسانوں کے مابین منافرت اور انتشار کی لمبی دیواریں حائل تھیں۔ ملوکیت اور پیشوائیت کے ہاتھوں انسان کو صیدِ زبوں بنایا جا چکا تھا۔ قیصر و کسریٰ نے اپنی سطوت کے بل پر اسے محکومی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ مجموعی صورت حال نے اُسے اس قدر بے بس اور مجبور بنا دیا تھا کہ غلامی نے اس کی فطرت کو مسخ کر کے اُس کی انسانیت کا خون کر دیا تھا ؎

از غلامی فطرتِ اُو دوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نے اُو خوں شدہ

نوعِ انسانی کی اس زبوں حالی پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے رحم فرما کر ہمارے پیارے نبی کو رحمت

اللعالمینؐ بنا کر اس دُنیا میں بھیجا تا کہ تاریکی کے دبیز پردے چاک ہو کر ایک نئے سورج کا طلوع ہو جو پوری دنیا کو اپنے نور سے منور کر دے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دُنیا اس محسن اعظم کے انتظار میں ایک طویل عرصے سے آنکھیں بچھائے ہوئی تھی۔ آخر کار جناب رحمت اللعالمینؐ کی بعثتِ شریف کے انوار سے ظلمت کافور ہو کر ہاتف کی طرف سے انسان کو یہ مژدۂ جانفزا مل ہی گیا

مبارک ہو کہ ختم المرسلین تشریف لے آئے　　جنابِ رحمت العالمینؐ تشریف لے آئے

بصد اندازِ یکتائی، بغایت شانِ زیبائی　　امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

بچپن سے لیکر کے جوانی تک آپؐ کے تمام تر افعال و اعمال آپؐ کے شایان شان تھے۔ چالیس برس کی عمر شریف میں آپؐ کے سرِ مبارک پر تاجِ نبوت رکھا گیا۔ حکمت ایزدی کے مطابق آپؐ سے ایک بڑے مشن کی تکمیل کرانا مقصود تھا۔ کہتے ہیں کہ منصب جتنا عظیم ہو، فرائض کی انجام دہی کی نوعیت بھی اُسی اعتبار سے عظیم ہوا کرتی ہے۔ حق تعالیٰ نے آپؐ کو ایک بھاری ذمہ داری سونپی تھی، جس کو انجام دینے کے دوران آپؐ کو شدید مخالف قوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عالمگیر تحریک کی ذمہ داری، ایک سلطنت کے سنجیدہ مسائل، ایک جماعت اور ایک معاشرے کے معاملات کا اور پھر اپنی گھریلو ذمہ داریاں۔ آپؐ کے لئے ہر لمحہ ایک نیا چیلنج لے کر آتا۔ ایک نئے نظامِ اخوت کی تاسیس رکھ کر تاریخ کا رُخ بدل دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے آپؐ مسلسل صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ دین حق کی سربلندی کیلئے آپؐ پر جادوگر، کہانت اور اس طرح کے کئی الزامات عائد کئے گئے۔ آپؐ کو پریشان کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی۔ دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں۔ لیکن اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جس قدر مشکلیں بڑھ جاتیں اُسی قدر آپؐ کے پائے ثبات میں استحکام پیدا ہوتا رہا۔ آپؐ نے ایک ایسے معاشرے کی نیو ڈالی جو انسانی اخوت، مساوات اور حریت کی زندہ و پائندہ مثال ہے۔ آپؐ کی رسالت کا مقصود کسی ایسے گروہ کا قیام عمل میں نہ لانا تھا جس میں اپنے ملک و قوم کی فضیلت کا سکہ بٹھانا مطلوب ہو بلکہ ایک عالمگیر معاشرے کی تعمیر تھا جو نوعِ انسانی کو انسان کی بندگی سے آزاد کر دے اور وہ صرف خدائے واحد کی بندگی کرے۔ اس معاشرے میں فقط خدا کا قانون نافذ العمل ہو۔ آپؐ نے نسل انسانی کی کنہ جس سنہرے اور لازوال اصول پر قائم کی، اُس کی رُو سے نوع انسانی خدا کا کنبہ ہے اور اس کنبے کے تئیں حسنِ سلوک کرنے والا خدا کا مقرب ہے۔ بعض مذاہب اس دنیا کو مستقل عذاب کی جگہ اور انسان کی تخلیق کو اس کے گناہوں کی پاداش سمجھنے کی بہت بڑی غلطی کر بیٹھتے ہیں لیکن اسلام اس دنیا کو انسان کیلئے دار العمل قرار دیتا ہے جہاں وہ اپنے نفس اور خیر کے راستے میں آنے والی مخالف قوتوں کا پامردی

سے مقابلہ کر کے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے اور آنحضورؐ روئے زمین کو مسجد سے تعبیر کرتے ہوئے اس کی تقدیس و تطہیر کا اعتراف فرماتے ہیں۔ یہ آپ کی ذاتِ گرامی ہے جنہوں نے انسان کو انسان کے تئیں رحم دلی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین فرمائی، بندگانِ خدا پر رحم نہ کرنے والے کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے رب سے رحم و کرم کی توقع کرے۔ یہ ہمارے آقائے نامدارؐ ہیں جنہوں نے نوعِ انسان کو احترامِ آدمیت کا سبق سکھلایا۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قبیح اور شرمناک رسم کا خاتمہ کر دیا اور اُنہیں خدا کی دیگر مخلوقات کی طرح زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیا بلکہ اُن کے جائز حقوق بھی مقرر کر دئے۔ آپؐ نے حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کو بخوبی انجام دینے کی نہ صرف تلقین فرمائی بلکہ آپؐ کی دی ہوئی تمام تعلیمات کا آپؐ نے ذاتی طور پر عملی مظاہرہ کر کے نوعِ انسانی کے سامنے رہتی دنیا تک ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔ آپؐ کی سیرت طیبہ قرآنی تعلیمات کی تعبیر و تشریح ہے۔ شہِ کونین ہو کر آپؐ نے اپنے لئے کوئی امتیاز قائم نہ کیا۔ ایک مرتبہ صحابۂ کرام کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، بھوک لگنے پر ایک بکری ذبح کرنے اور پکانے کا باہمی طور پر مشورہ ہوا۔ سب نے ایک ایک کام اپنے ذمہ لیا۔ آپؐ نے لکڑی جمع کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس پر صحابہ نے کہا کہ ہم آپؐ کا کام کریں گے۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ یہ مجھے پسند نہیں کہ میں تم پر امتیاز حاصل کروں، اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بندوں کی یہ حرکت پسند نہیں۔ اور پھر آپ لکڑیاں جمع فرماتے رہے۔ الغرض زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ اور اللہ کی پسند اور ناپسند کا لحاظ رکھتے۔ اخوت، مساوات، ایثار، ہمدردی، وفا شعاری، صبر و قناعت، تسلیم و رضا، فقر و غنا، جود و سخا، مہمان نوازی، خدا ترسی، عبادت گزاری، عفو و درگذر، قوتِ برداشت، بردباری، عدل و انصاف، پاکبازی آپ کی لاتعداد اوصافِ حمیدہ میں سے چند ایک ہیں جو تاریخ عالم کسی ایک شخصیت میں پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گی۔

آپؐ کی سیرت پاک ہر اعتبار سے عالمگیر اہمیت کی حامل ہے۔ انسانی زندگی کے تمام تر شعبوں میں اس کی اتباع کرنے کی شدید احتیاج ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اگرچہ صرف سماجی اعتبار سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپؐ نے پورے معاشرے کو ایک عادلانہ نظام اور اعلیٰ اقدار سے آراستہ فرمادیا۔ معاشی اعتبار سے تقسیم و گردش دولت کا نہایت خوب صورت اور منطقی نظام نافذ فرمایا جس سے ارتکازِ دولت کے تمام تر امکانات ختم ہو کر رہ گئے۔ تقسیم وراثت، تحدید وصیت، حرمتِ سود، حکم انفاق، ناجائز ذرائع کی ممانعت اور سرمایہ و دولت پر زکوٰۃ و عُشر کے محصولات کی مثالیں آپؐ کی سیرتِ پاک کی سماجی اہمیت کی جانب ہلکا سا اشارہ کرتی ہیں۔

جناب آقائے نامدارؐ کے رحمت اللعالمین کی حیثیت سے نوعِ انسان پر جو بے شمار احسانات

ہیں، اُن کا اعتراف اور تذکرہ کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان احسانات کے عوض سیرت پاک کی اتباع بندگانِ خدا پر ناگزیر ہے کیونکہ دورِ حاضر کے انسان کے تمام امراض کا علاج اسلامی تعلیمات پر کاربند ہونے میں مضمر ہے۔ تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے عبادت و اخلاق سے لیکر کے معاملات و معاشرت تک جملہ شعبہ ہائے حیات میں سرورِ دو عالمؐ کی سیرت و سنت کی پیروی کا اہتمام کیا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے زندگی بھر خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا کیونکہ اُنہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میرے آقاؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ ایک واقعہ کی رُو سے بتایا جاتا ہے کہ جب سرورِ کائناتؐ اس ظاہری دنیا سے نقل کر گئے تو ایک صاحب کے کانوں تک جب یہ پُر ملال خبر پہنچی تو انہوں نے خدا سے دعا کی کہ اے خدا مجھے فاقد البصر کر دے کیونکہ میری آنکھیں اب آقائے نامدار کو ظاہر میں دیکھنے سے محروم ہو گئیں۔ وہ بھی ایک دور تھا جب مسلمانوں نے آنحضورؐ کی مکمل اتباع کر کے آپؐ کے احسانات کو حقیقی معنوں میں سمجھتے ہوئے خود کو تاریخ کا ناقابلِ فراموش باب بنا دیا۔ لیکن بعد میں مختلف وجوہات کی بناء پر مسلمان قرآن و سنت سے برگشتہ ہو کر روبہ انحطاط ہوتے گئے، جس نے دنیا کے باشعور طبقے اور اہل فکر و نظر مسلمانوں کو گہری تشویش میں ڈال کر مسلمانوں کے احیاء پر غور و فکر کرنے کی طرف راغب کیا، حکیم الامت علامہ اقبال انہیں اہل فکر و نظر میں سے ایک مسلم دانشور اور اسلام کے داعی تھے جنہوں نے اُمت مسلمہ کے زوال کے اسباب پر تفکر و تدبر کر کے اُنہیں دوبارہ سربلند ہونے کا نسخۂ کیمیا عطا کیا۔ علامہ نے مسلمانوں کو تمام اُمتوں کی ساقی گری کی خدمت کا فریضہ انجام دینے کا احساس دلایا اور انہیں پھر سے صداقت، شجاعت اور عدالت کا سبق پڑھنے کی ہدایت کی تا کہ اُن سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے۔ اقبال مسلمانوں سے دوبارہ قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں تا کہ وہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔

آخر میں ملت اسلامیہ کے دردمند شاعر مولانا الطاف حسین حالیؔ کے مشہور زمانہ اشعار کے ذریعے کائنات کے محسن اعظمؐ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہوں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا — بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

علّامہ اقبالؔ اور شہادت حسینؑ

؎ قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسلامی سال کی ابتداء محرم الحرام سے ہوتی ہے۔ یہ مہینہ شہادت امام عالی مقام جناب سیدنا حضرت حسینؓ، جوانہوں نے کربلا کی سرزمین پر اپنے عزیز واقرباء اور اصحاب پر مشتمل ۷۲- افراد کے قافلے کے ہمراہ حق کی سربلندی کی خاطر باطل سے برسرِ پیکار ہوکر پیش کی تھی، کی بدولت خاصا معظم ہے۔ اس تعظیم وتکریم والے ماہ کی دس تاریخ کو جونا قابل فراموش واقعہ رونما ہوا ہے، وہ اسلامی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کا ایک المناک باب ہونے کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کیلئے ایک روشن باب بھی ہے، جس کی درخشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہیگا، کیونکہ حضرت امام حسینؓ نے اپنی بے مثال قربانی سے انسانی اقدار کی محافظت اور بحالی کی حق پرستی پر مبنی اپنی جرأت مندانہ کوششوں کے ذریعے انسانی ضمیر کو مصلحت کوشیوں اور خوف وخطر سے نجات دلائی، چنانچہ حسینؓ ایک نام یا کردار ہی نہیں بلکہ حق وحریت کی ایک تابندہ علامت اور قدر بھی ہے۔

تخلیقِ کائنات ہی سے خیر وشر یا حق وباطل کی معرکہ آرائی کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وجاعل حق وزحق باطل انا الباطل کان زھوقا۔ جہاں تک شہادتِ حسینؓ، یا واقعۂ کربلا یا حادثۂ کربلا کا تعلق ہے۔ یہ حق وباطل کی اس باہمی آویزش کا نام ہے جو آج سے ایک طویل عرصہ پہلے ۱۰/محرم الحرام سن ۶۱ ہجری بمطابق ۶۸۰ عیسوی کو میدانِ کربلا میں وقوع پذیر ہوئی۔ امیر معاویہ کے بعد جب یزید حکمران بنا تو اس نے اپنی بھاری طاقت سے لیس ہوکر خلافت کے اسلامی اصول پر کاری ضرب لگا کر اسے خاندانی بادشاہت یا ملوکیت میں تبدیل کر کے عوام پر ظلم واستبداد اور ان کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا طویل سلسلہ شروع کیا، جس کے خلاف حضرت حسینؓ اس کی بھاری فوج سے صف آرا ہوئے۔ حضرت حسینؓ کا قافلہ فقط ۷۲- افراد پر مشتمل تھا جس میں بزرگ، خواتین اور معصوم بچے یہاں

تک کہ چھ ماہ کا علی اصغر بھی شامل تھا۔ حضرت حسین نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے انسان کی حریت کیلئے بے مثال قربانی پیش کی۔ دین حق کی بقاء ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب چاہے، اپنے پیارے بندوں کو اس دین کی سرفرازی کی خدمت کرنے کی سعادت بخشتا رہے گا۔ مسجود ملائک حضرت آدم کی اولاد کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ کرۂ ارض پر نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دینے کیلئے اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کیلئے وقف کردے۔

واقعۂ کربلا کو رونما ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس طویل عرصے میں ملت اسلامیہ کے محققین، مفکرین، فقہا، محدثین، صوفیائے کرام، علمائے عظام اور شعراء حضرات نے تاریخ کے اس عظیم سانحے پر بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں۔

جہاں تک حکیم الامت اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے ترجمان علامہ محمد اقبال کا تعلق ہے، انہوں نے اپنے نظام فکر کی اساس دین اسلام کی ابدی تعلیمات پر قائم کی ہے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات میں نمایاں رول ادا کرنے والی عظیم المرتبت شخصیات کی خدمات اور ان کے لازوال کارناموں کے پیش نظر انہوں نے انہیں قرار واقعی خراج پیش کیا ہے۔ شاعری کو جزویست از پیغمبری قرار دینے والے اس نابغۂ روزگار نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ہی کسی اضطراری کوشش کے تحت نہیں بلکہ ایک باقاعدہ مشن کے تحت کیا، کیونکہ اس دور میں عالمی صورت حال بالعموم اور امت مسلمہ کی بالخصوص ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر انہوں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کیلئے ایک صالح عالمگیر معاشرے کا قیام عمل میں لانے کی خاطر اجتہادی کوششیں کیں جس کے لئے پہل کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد کی گئی تاکہ وہ امت خیر الناس ہونے کے ناتے ساقی گری کی خدمت انجام دیکر اقوام عالم کیلئے ایک نمونہ بن جائے۔ اقبال اسلامی تعلیمات کے آئینے میں حریتِ انسان کے قائل ہیں لیکن اس حریت کے نہیں جو بے زمام ہو بلکہ اس حریت کے جو انسان کو ہر طرح کی غلامی سے آزاد کر کے ایک خدا کی بندگی اور رسول کی اتباع کرنا سکھاتی ہے۔ یہی اس کے آزاد ہونے کی سند ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے انسان کو دیتا ہے نجات
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

بہ مصطفیٰؐ بہ رساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدے تمام بولہبی است

اور بقول ''شاہنامۂ اسلام'' کے مصنف حفیظ جالندھری

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی[۲]

عشق رسولؐ اقبال کی شخصیت کا ایک نمایاں اور روشن پہلو ہے۔ عشقِ رسولؐ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اس ذات کو اپنی جان، اپنی اولاد اور اپنے تمام عزیز و اقرباء سے عزیز تر رکھے۔ اقبال کو آپؐ کی ذات گرامی سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی جس کی جیتی جاگتی مثالیں ان کے پورے فکری نظام سے فراہم ہوتی ہیں۔ آپ کو حضرت حسینؓ سے بے حد محبت تھی۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے۔ ''حسین منی وانا من الحسین۔ یعنی حسین مجھ سے اور میں حسین سے ہوں۔ آپؐ نے خدا کی بارگاہ میں دعا فرمائی ہے کہ باری تعالیٰ میں حسین سے محبت کرتا ہوں۔ تو بھی اس سے وفا کرنا۔ اہل بیت اطہار کے مثالی کردار کی بدولت اور خاندان نبوت کے افراد ہونے کی بناء پر اقبال کو بھی ان سے محبت و عقیدت رہی ہے۔ اقبال خاندان رسالت کے ہر فرد سے نہ صرف بے پناہ اور والہانہ محبت و عقیدت رکھتے تھے بلکہ اس محبت و عقیدت کو وہ جزو ایمان سمجھتے تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؑ[۳]، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ، کے تئیں علامہ اقبال کی محبت و عقیدت کا اندازہ ان کے کلام کے مطالعے سے صاف ظاہر ہے۔ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام دونوں میں مختلف مقامات پر حضرت امام حسینؓ کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اپنی پہلی فارسی تصنیف ''اسرار خودی'' کے حصۂ دوم ''رموز بے خودی'' میں توحید اور رسالت کے بعد ''در معنیٔ حریت اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا'' عنوان کے تحت اس خونین واقعے کو ایک حادثہ سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے اسرار بیان کئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حریت اسلامیہ کو واضح کرنے کیلئے کربلا سے بڑا حادثہ اور حضرت حسینؓ سے بڑھ کر اور کون سا کردار ہو سکتا تھا۔ خدائے واحد سے اپنا رشتہ جوڑنے والے دنیا کی ہر باطل قوت سے خود کو آزاد کر دیتے ہیں۔ ایسا جب ہی ممکن ہے کہ جب انسان عشقِ خداوندی اختیار کر لے اور خدا سے عشق کرنے کیلئے اس کے حبیب محمد رسول اللہؐ سے عشق کرنے کا تقاضا ہے۔ مومنین اس تقاضے کی تکمیل سے سرفراز ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ مومن عشقِ الٰہی سے قائم ہے اور عشق کا وجود مومن سے ہے۔ چنانچہ اقبال ''رموزِ بے خودی'' کے مذکورہ عنوان کے تحت عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے عشق کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عشق کے لامحدود امکانات ہیں، جو چیزیں ایک عام انسان کیلئے ناممکن ہیں، عشق انہیں ممکنات میں بدل دیتا ہے۔ عشق اپنے مقاصد میں جلیل، پاکیزہ اور بے باک ہوتا ہے، وہ

بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے اور عقل محوِ تماشارہ جاتی ہے۔ عشق انسان کو ایک خدا کی بندگی اختیار کرنے اور باقی تمام باطل خداؤں سے آزاد ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ عشق حریت کا خواہاں ہوتا ہے اور یہ حریت اسے تسکین قلب کی دولتِ بے بہا عطا کرتی ہے۔ اقبال امام عاشقان، نواسۂ رسولؐ، شہزادۂ بتولؓ، علی مرتضیٰؓ کے نور نظر حضرت حسینؓ کی بے مثال قربانی کو وفدینہ بذبحٍ عظیم کی قرآنی آیت کے مصداق قرار دیتے ہیں۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر　　معنی ذبح عظیم آمد پدر

حضرت حسینؓ کے والد گرامی حضرت علی مرتضیٰؓ کا مرتبہ بائے بسم اللہ کا تھا۔ یعنی بسم اللہ کی "ب"۔ فارسی کے معروف شاعر قاآنی نے بھی حضرت علی مرتضیٰؓ کو بائے بسم اللہ کہا ہے۔

حادثۂ کربلا میں وقوع پذیر شہادت ہی اولادِ ابراہیم کی ذبح عظیم تھی۔ ترجمان القرآن کے مصنف ابوالکلام آزاد نے یہی نکتہ اپنی تحریروں میں ایک جگہ یوں بیان کیا ہے۔

"حقیقت، جس کا حضرت اسماعیلؑ کی ذات سے ظہور ہوا تھا، وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت یحییٰ کی ذات تک پہنچ کر گم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسینؓ نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔"

اور بقول اقبال ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسماعیلؑ

اقبال نے حضرت حسینؓ کے عالی مرتبے کا بیان نہایت عمدہ پیرائے میں کیا ہے۔ مثلاً تاجدارِ کائنات کا شانۂ مبارک ان کے لئے نعم الجمل ہے یعنی اچھی سواری تھی۔ نعم الجمل کے الفاظ برت کر اقبال نے اس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے جس کی رُو سے ایک موقعے پر رسول محترم حسینؓ کو اپنے دونوں شانۂ مبارک پر اٹھائے تشریف لئے جا رہے تھے کہ کسی نے کہا۔ نعم الجمل یعنی کتنی اچھی سواری ہے۔ اس پر حسینؓ کے نانا جانؐ نے فرمایا۔ سوار بھی تو اچھے ہیں۔ آپؐ اپنے نواسوں کو اپنے گلستان کے پھولوں سے تعبیر فرماتے تھے ؎

حسینؓ و حسنؓ بلبلانِ محمدؐ　　یہے رونقِ گلستانِ محمدؐ

اقبال امام عالی مقام کی عظیم المرتبت شخصیت کو امت مسلمہ میں اسی حیثیت کا حامل قرار دیتے ہیں جو حیثیت فرقانِ مجید میں سورۂ اخلاص کو حاصل ہے۔ سورۂ اخلاص کلام مقدس کے ثلث یعنی تیسرے حصے کے برابر ہے۔ یہ سورۃ اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کی ترجمان ہے۔ حضرت سیدنا حسینؓ نے اپنی لازوال قربانی

سے خوابیدہ ملت کو بیداری کا پیغام دیا اور خدا کی وحدانیت کا ایک ایسا نقش قائم کیا جو ہماری نجات کا عنوان بن گیا۔

تاریخ میں کتنے ہی واقعات رونما ہو کر قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئے لیکن امام عالی مقام نے خدا کی وحدانیت کا نعرہ بلند کر کے امت مسلمہ کے ایمان کو تر و تازہ کر دیا۔ چنانچہ اقبال ایمان کو تر و تازہ کر دینے والی اس عظیم المرتبت شخصیت حضرت حسینؓ کو آنسوؤں کا خراج یوں پیش کرتے ہیں ؎

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت — سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآن از حسینؓ آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز
اے صبا! اے پیک دور افتادگاں — اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہادت حسینؓ کو یاد کرنا اور انہیں خراج پیش کرنے سے کیا ان کی دی ہوئی عظیم قربانی کا حق ادا ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے بجا فرمایا ہے ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شہادت امام عالی مقام کوئی ماتم رفتگان نہیں بلکہ یہ وہ نعرۂ انقلاب ہے جو قیامت تک انسان کو باطل کے خلاف حق پر ڈٹے رہنے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ترغیب دلاتا رہیگا۔ دورِ حاضر میں ہر سُو باطل کی حکمرانی ہے، انسانیت ہر طرف پامال ہو رہی ہے۔ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے، انسانیت کو قدم قدم پر معرکۂ حق و باطل کا سامنا ہے۔ لیکن ضمیر خفتہ ہوں، دلوں پر قفل پڑے ہوں، اخروی زندگی پر دنیوی زندگی کو ترجیح دی جائے، اور اپنے ذاتی مفادات معرضِ خطر میں پڑنے کا اندیشہ لاحق ہو، تو ایسے حالات میں حضرت حسینؓ کی دی ہوئی لازوال قربانی کی لاج کیسے رکھی جا سکتی ہے، لیکن مومنوں کی زندگی سود و زیاں، مصلحت کوشیوں اور بڑی سے بڑی باطل قوت کے خوف و خطر سے بالکل بالاتر ہوتی ہے، مومنین حق کی خاطر جیتے ہیں حق کی خاطر مرتے ہیں۔ آخر ہمیں خدائے عزوجل نے جو حیاتِ مستعار بخشی ہے۔ اس کے حق کی ادائیگی کا سلیقہ ہمیں حضرت حسینؓ کی بے مثال قربانی سے سیکھنا چاہیے۔

اقبال بجا طور پر اسلامی دنیا میں حسینی صفات یا حسینی کردار کو ناپید ہوتے ہوئے دیکھ کر یوں نوحہ خواں ہیں ؎

ریگِ عراقِ منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ و شام خویش را
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

حوالہ جات:

۱۔روایت ہے کہ حضرت حسینؑ نے اپنے گھر کے افراد کو قافلہ کے سب سے پیچھے رکھا تا کہ وہ کربلا کی جھلسا دینے والی ریت کی حدت اور پیاس کو زیادہ سے زیادہ وقت تک برداشت کرتے رہیں۔اس واقعہ میں کربلا میں دو بدری صحابہ نے بھی شرکت فرمائی۔حضرت حسینؑ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کے ارادے میں اس قدر مستحکم تھے کہ انہوں نے چراغ کو گل کر کے کہہ دیا کہ اگر قافلے میں سے کوئی پیچھے ہٹنا چاہتا ہے تو اسے ہٹنے کا اختیار حاصل ہے۔یعنی انہوں نے یزید کے خلاف معرکہ آرا ہونے کی ٹھان لی تھی۔افراد کی تعداد کی فکر سے وہ بے نیاز تھے۔

۲۔ محمد کی محبت، دین حق کی شرط اول ہے — محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے — خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

۳۔حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی شخصیت کے تئیں اقبال کی بے پناہ اور والہانہ عقیدت کی کئی وجوہات ہیں۔آپؑ کی حق پرستی اور فرض امومت کی مکمل ادائیگی کے نتیجے میں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ جیسے فرزندوں کی تربیت کہ انہوں نے اپنی تمام تر زندگی حق پرستی میں گزار کر حق کے بول بالا کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔اقبال حضرت فاطمۃ الزہراؑ سے محبت وعقیدت کی بناء پر ان کے مرقد مقدس پر سجدوں کی بارش کر دینے کی بات کرتے ہیں لیکن حق انہیں اس کی اجازت دینے سے قاصر ہے۔

۴۔جمل اونٹ کو کہتے ہیں

اقبال اور امومت

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ　　اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

وجودِ زن کو نظامِ کائنات میں ناگزیر اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور کرنا ممکن نہیں، چنانچہ دُنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں اس اہم ترین ہستی کو مختلف پیرائے میں موضوعِ فکر بنایا گیا ہے۔ بعض نے اِسے جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور بعض نظامِ ہستی میں اس کی اہمیت اور اس کے کردار کو پیش کر چکے ہیں۔ ہمارے افسانوی ادب میں اِسے وفا اور ایثار کا پیکر ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے بسی اور مجبوری کا بھی رونا رویا گیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کی نظم "مناجاتِ بیوہ" میں ایک غم زدہ عورت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے جب کہ جاں نثار اخترؔ اور فراقؔ گورکھپوری دونوں نے عورت کو ہندوستانی تناظر میں گھر کی چار دیواری کے اندر دیکھ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب کے خلاف تھے اِس لئے وہ اُس عورت کے بالکل حق میں نہیں جس پر مغربی اثرات کی چھاپ ہو۔ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری میں نسوانی کردار کی خوبصورتی ایک غالب عنصر کے طور پر کارفرما رہی ہے۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبال چونکہ اسلامی مفکر شاعر تھے اِس لئے اُنہوں نے عورت کے وجود اور اس کے کردار کو اسلامی زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جس کے وجود کی بدولت تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ اقبال کے افکار کی بنیاد فلسفۂ خودی ہے جسے استحکام بخش کر اقبال عالمگیر سطح پر ایک صالح معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کے شدید متمنی ہیں۔ اس کے لئے ایسے افراد کی احتیاج ہے جن کی ماؤں نے انہیں ایسا تربیت یافتہ کیا ہو کہ وہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کر سکیں۔ اقبال عورت کے ظاہری حسن و جمال کے جلووں سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں بلکہ وہ اس کی حیا عفت اور پاکبازی کو ترجیح دے کر اس کی تخلیق کے بنیادی مقصد یعنی امومت کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ حسن و جمال کی اہمیت سے کسی کو مفر نہیں، تاہم حسن کوئی دائمی شئے نہیں بلکہ اس کی حیثیت

عارضی ہے، اقبال نے ایک مسلم دانشور ہونے کے ناتے اپنے فکر کی اساس دین اسلام کی ابدی یا سرمدی تعلیمات پر قائم کی ہے۔ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو حیات انسانی کے نظام میں اعتدال برقرار رکھنے کی خاطر فحاشی اور بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ خواتین کی عزت و ناموس کی محافظت کے لئے وہ اُنہیں خدائے برتر سے سبق سیکھ کر باپردہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں جو صدہا تجلیوں کے باوجود پردے میں ہے۔

جہاں تابی زنورِ حق بیاموز کہ او با صد تجلی در حجاب است

اقبال کو پیغمبر اسلام نبی آخرالزماں کی ذاتِ اقدس کے تئیں بے پناہ اور والہانہ عقیدت و عشق تھا۔ آپؐ نے عورت کا نام خوشبو اور نماز کے ساتھ لیا ہے۔ خواتین انسانی معاشرے کا جزو لاینفک ہیں جنہیں اقبال نے کنبے کی اصل کہہ کر حیاتِ انسانی کے تحفظ کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ اقبال اسلامی تشخص کا گہرا شعور رکھتے تھے اور یہ اُمتِ مسلمہ ہی ہے جسے دُنیا کی تمام امتوں کے لئے ساقی گری کی خدمت انجام دینا ہے۔ اقبال کے دور میں نو آبادکار قوتیں مختلف روپ دھار کر ناموس انسانی کی دھجیاں اُڑا رہی تھیں اور اقوام عالم کو مغلوب کر کے اُن پر بڑی سرعت کے ساتھ اپنے گہرے منفی اثرات ڈال رہی تھیں۔ مسلمان اپنا تشخص کھو رہے تھے اور آج تک وہ اپنے تشخص کو قائم نہیں کر پا رہے ہیں۔ چنانچہ مسلم خواتین کا مغربی اثرات سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ اِدھر اقبال اُمت مسلمہ کے احیائے نو کے شدید خواہاں تھے۔ وہ مسلمانوں کو روبہ انحطاط دیکھ کر اُنہیں اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کرنے کی پُرزور تلقین کر رہے تھے، چنانچہ مسلمان خواتین پر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو اسوۂ کاملہ بنانے پر زور دے رہے تھے۔ اقبال کے دل میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے تئیں بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی ایسی تربیت کی کہ رہتی دُنیا تک اُن کا نام زندہ و جاوید رہے گا۔ آپؓ کے دونوں صاحبزادوں نے اسلام کی بے مثال خدمت انجام دی۔ حضرت امام حسنؓ نے اسلامی ریاست کے اتحاد اور مسلم دُنیا میں امن و آشتی کی خاطر اپنا حق خلافت چھوڑ دیا۔ حضرت امام حسینؓ نے معرکۂ حق و باطل میں اپنے پورے اہل و عیال کے ہمراہ راہ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اور ایک تاریخ رقم کی۔

سیم و زر کسی بھی قوم یا جماعت کا اثاثہ نہیں ہوا کرتے۔ اقوام و ملل کی اصل دولت اُس کے غیور اور حق پرست فرزند ہوا کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں دین و دُنیا کے تئیں نوجوانوں کے رویئے کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ نپولین بوناپارٹ نے ایک اچھی قوم کی تعمیر کی خاطر بجا طور پر اچھی ماؤں کا مطالبہ کیا تھا کیونکہ افراد اور قوموں کی تعمیر و تشکیل میں مائیں غیر معمولی رول ادا کرتی ہیں۔ اقبال نے اپنی پہلی

فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے حصّہ دوم ''رموزِ بے خودی'' کے عنوان ''در معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است وحفظ واحترام امومت اسلام است'' کے تحت امومت کی فضیلتوں کا یوں ذکر کیا ہے ؎

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است — سیرت اقوام را صورتگر است

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

ملت از تکریمِ ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اسرارِ حیات

از امومت پیچ و تابِ جوئے ما — موج و گرداب و حباب جوئے ما

بنی نوع انسان کا تحفظ امومت پر منحصر ہے اور امومت کا تحفظ اور آبرو اسلام کی اساس یا روح ہے۔ مذکورہ بالا عنوان کے تحت اقبال نے امومت کی فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مثالی خاتون کا قومی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ عورت کی آبرو کا اس بات پر انحصار ہے کہ وہ نیک اور صالح مسلمان نوجوان پیدا کرے۔ اقبال کے نزدیک وہ عورت بیکار ہے جو تعلیم یافتہ اور شائستہ ہونے کے باوجود امومت کے معنی و مفہوم اور رُوح سے بیگانہ ہو۔ اُن کے خیال میں بہتر یہی ہے کہ ایسا پھول باغ میں بالکل نہ کھلے۔ ایک قوم کی اصل دولت اس کے توانا، تندرست، محنتی اور خداترس نوجوان ہیں۔ امومت رحمتِ خداوندی کا ظہور ہے، کیونکہ اس کا ہمارے پیارے نبیؐ سے رشتہ ہے۔ آپؐ نہایت رحمدل تھے۔ مائیں بھی رحمتِ خداوندی اور نور خداوندی سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ ہمارے پیارے نبیؐ اقوام کے کردار کا سانچہ تیار کرتے ہیں، مائیں بھی اپنے طور پر یہ فرض انجام دیتی ہیں۔ بچوں کا کردار ماؤں کی تربیت کے نتیجے میں مستحکم ہوتا ہے۔۔ یہی بچے بڑے ہو کر اپنی معزز ماؤں کی نگہداشت کے نتیجے میں قومی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں امومت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ، حسین اور دلکش لڑکی، جو مغربی طرزِ فکر و عمل سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اسلام کی حدود کو توڑ کر فرض امومت سے انحراف کرے، کی نسبت وہ ناشائستہ، ان پڑھ، بدصورت لڑکی کئی گنا بہتر ہے جس کی آغوش سے ملّت کو ایک نیک صالح مسلمان میسّر آجائے۔ اقبال کو حضرت مریمؑ ایک نسبت کی بدولت عزیز ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ ہیں جبکہ حضرت فاطمہ الزہراؓ کو وہ تین نسبتوں کے باعث عزیز رکھتے ہیں۔ اول وہ تاجدارِ کائناتؐ کی صاحبزادی ہیں۔ دوم وہ اسلام کے خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کی زوجہ مطہرہ ہیں، سوم وہ اسلام کے دو عظیم فرزندوں کی والدہ ماجدہ ہیں، جو غریبوں، اور حاجت مندوں کی حاجت روا، نرم طبعیت، مخلص اور قانون ایزدی کی تابع تھیں، تمام نسوانی اوصاف کا بہترین پیکر تھیں، خداترس ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب کے گہرے علم و شعور

سے بہرہ مند تھیں۔ خانگی امور کی انجام دہی کے دوران تلاوتِ قرآن اور یادِ خدا میں مصروف عمل رہا کرتی تھیں۔ آپؓ کی انہیں خوبیوں کے پیش نظر اقبال آپؓ کے مرقد پر سجدوں کی بارش کر دینے کے شدید متمنی ہیں لیکن قرآن وحدیث انہیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔

رشتۂ آئین حق زنجیرِ پاست　　پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے　　سجدہ ہا بر خاکِ اُو پاشیدمے

اقبال ''مخدراتِ اسلام'' عنوان کے تحت اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ پردہ نشین مسلم خواتین خدائی قانون کی نائب ہیں، اوران کا بے داغ کردار اور فطرت مذہب کو قوت اور ملت کو اساس فراہم کرتا ہے۔ وہ انہیں عصر حاضر کے اُن خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں جو دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی گھات میں ہیں۔ وہ مسلمان خواتین کو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو اسوۂ کاملہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اِسی طرح اقبال ''بانگِ درا'' میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ کو خراج پیش کرتے ہیں۔ فاطمہ طرابلس کی جنگ میں شہیدوں کو پانی پلاتی ہوئی جام شہادت نوش کر گئیں۔ اقبال نے اُنہیں آبروئے ملت مرحوم کہا ہے۔

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کے فلک مریخ والے فصل میں نبیۂ مریخ ختم نبوت کا دعویٰ کرتی ہے۔ وہ خواتین کے ایک مجمے سے مخاطب ہو کر اُنہیں رشتۂ ازدواج سے خود کو دُور رکھنے کے لئے کہتی ہے تا کہ بچے پیدا کر کے اور فرض امومت ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے زرد نہ پڑ جائیں اور وہ اپنا تمامتر حسن کھو نہ بیٹھیں۔ جب کہ عورت کا وجود نسل انسانی کی بقا کی خاطر عمل میں لایا گیا ہے۔ امومت کے فرض سے خود کو دُور رکھتے ہوئے نظامِ کائنات میں خلل پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہے، اِس لئے اقبال کے نزدیک نہ پردہ اور نہ تعلیم، نئی ہو کہ پُرانی، عورت کی نگہبانی کر سکتے ہیں، عورت کی نسوانیت کا اگر کوئی نگہبان ہے تو وہ صرف اور صرف مرد ہے۔

اقبال نے ایک اور مسلمان خاتون بیگم شرف النساؔ (جاوید نامہ) کو خراج پیش کیا ہے جو اپنا زیادہ تر وقت تلاوت قرآن پاک میں صرف کیا کرتی تھیں۔ اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ قرآن اور تلوار، جو ایک دوسرے کے محافظ ہیں، اُن کی رحلت کے بعد اُن سے ہرگز جُدا نہ کئے جائیں۔ اِسطرح اقبال اس پاکباز خاتون کے صالح کردار کے پیش نظر انہیں خراج پیش کرتے ہیں۔

وقت یا زمانے میں خاصا تغیر وتبدل واقع ہوا ہے۔ عصرِ حاضر کی خواتین کو زندگی کے مختلف اور نت نئے چیلینجوں کا سامنا ہے۔ اقبال مرد اور عورت دونوں کے لئے تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہیں، تاہم وہ اُس تعلیم کے ہرگز حامی نہیں، جو عورت کو اپنی اصل یا نسوانیت سے بیگانہ کر دے۔ مرد اور عورت دونوں پر

جُدا جُدا فرائض عاید کیے جا چکے ہیں۔ عورت کا اصل کام امومت کے فرض کی انجام دہی ہے۔ اِس فرض کی ادائیگی اس قدر آسان نہیں، جس قدر سمجھی جاتی ہے۔ بدلتے زمانے کے تناظر میں خواتین کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں، تعلیم کے نور کو لے کر اپنی پاک دامنی کو ہر حال میں برقرار رکھیں، اور اُس مقصد کو بھی پورا کریں جس کے لئے اُنہیں خالقِ کائنات نے خلق کیا ہے۔ اِسی سے ان کی عزت و آبرو باقی ہے۔ ملّتِ محمدیہ کی محافظ ہونے کے ناتے اُنہیں ابلیسیت کے اس دَور میں دین کے شجر کی آبیاری کرنا ہے۔

نہ میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

حکیم الامت علامہ محمد اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے مفکر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ فلسفی تو بہت ہوئے ہیں لیکن اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فلسفہ کو (جسے انہوں نے خودزندگی سے دوری کا نام دیا ہے) شاعری کے رگ وپے میں اس طرح تحلیل اور پیوست کر دیا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک فکر کو جذبے کا سوز و گداز عطا نہ کیا جائے، تب تک حیاتِ انسانی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ انہوں نے فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، چنانچہ شاعری کے مقابلے میں انہوں نے اپنے افکار کو نثر میں کم ہی پیش کیا۔ اُن کے یہاں جب فلسفہ شعر بنتا ہے تو اس کی قدر و قیمت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری اور فکر (نیز اُن کے خطبات اور دیگر نثری تحریریں) اقبال کو اپنے صحیح یا حقیقی تناظر میں سمجھنے میں ہماری معاونت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا کام انجام دیتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب تک قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ مشرقی اور مغربی علوم اور دونوں کے فکر و فلسفے اور ادبیات وغیرہ کو ملحوظ رکھ کر اقبال کا مطالعہ نہ کیا جائے تب تک اقبال کے افکار و تاثرات سے صحیح طور سے آگہی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تفہیم اقبال کے لئے نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ ناگزیر ہے۔ شاعری کو جزویست از پیغمبری کہا گیا ہے۔ اقبال نے بہ حسن و خوبی اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس شاعری سے ملت کو قوت اور توانائی حاصل ہو، اُس کے حوصلے بلند ہوں، اُسے انگریزی شاعر ٹینی سن نے اعمالِ حسنہ میں شمار کیا ہے۔ اقبال نے خود کو رسمی معنوں میں شاعر کہلوانے سے انکار کیا لیکن وہ بہر حال ایک شاعر تھے تاہم شاعری کو انہوں نے ایک عظیم مقصد کیلئے استعمال کیا۔ خود کہتے ہیں۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

خود کو شاعر نہ کہتے ہوئے بھی اُن کی شاعرانہ حیثیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ سازِ سخن کو اپنے لئے ایک بہانہ سے تعبیر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے فن سے ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لے جانے کی بات کی

ہے۔ یاد رہے کہ اقبال وہ پہلے شاعر نہیں جنہوں نے ملت اسلامیہ کے پُر شکوہ ماضی، اسلام کے مدوجزر اور موجودہ دور کے مسلمانوں کے انحطاط کی صورتحال کے پیش نظر انہیں دوبارہ اپنی عظمت رفتہ حاصل کرنے کی تلقین کی ہے، ان سے پہلے کے بزرگ اور برگزیدہ شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے بھی مدوجزر اسلام کو موضوع بنا کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔ چنانچہ حالی وغیرہ سے اقبال کا متاثر ہونا یقینی ہے اور بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر حالی نہ ہوتے تو غالباً اقبال بھی نہ ہوتے، میرے نزدیک اقبال کی فکری تعمیر میں مولانا حالی کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ نیز دیگر کئی شخصیات نے بھی اقبال کی فکری تعمیر و تشکیل کی اساس فراہم کرنے میں اپنا رول ادا کیا ہے۔ تاہم اقبال کا امتیاز و اختصاص یہ ہے کہ پوری اُردو شاعری کی تاریخ میں سب سے زیادہ وسیع المطالعہ، سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والے، سب سے زیادہ گہرے اور نازک شعور و احساس کا مالک ہونے کے ناتے اقبال کی بات ہی کچھ اور ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں پر اقبال کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے بیش بہا علمی و ادبی خزینوں، فکر و فلسفے اور مختلف علوم و فنون سے کما حقہ استفادہ کرتے ہوئے اپنی تخلیقی توانائی و برنائی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے نظامِ فکر کا تار و پود عظیم صحیفۂ کائنات قرآن مقدس اور احادیث سے تیار کیا۔ مسلمانوں سے رہ رہ کر مخاطب ہونے کی بناء پر علامہ کو شاعرِ اسلام کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اُن کے شاعر اسلام ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تاہم بعض لوگوں کی کور نگاہی، کم سوادی اور دوں فطرتی کے باعث اسلام کو مسلمانوں تک محدود کرتے ہوئے اقبال کو فقط ایک فرقے کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح اُن کی آفاقی اور عالمگیر حیثیت اور اہمیت کو نظر انداز کر کے اُن کے مقام و مرتبے کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاحیں اپنے اندر اس قدر وسعت اور تنوع رکھتی ہیں کہ یہاں رنگ و نسل، مذہب، زبان اور جغرافیائی حدود کے تمام تر امتیازات مٹ جاتے ہیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اقبال دنیا کے تمام ادیان کا وسیع اور غائر مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بنی نوع انسان کو اگر کہیں اماں مل سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام اور قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے۔ حیاتِ انسانی میں آئے دن پیش آنے والے تمام تر مسائل کا بہترین حل اسلام اور قرآن کے سوا اور کہیں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام سلامتی اور امن و آشتی کا دین ہے۔ قرآن بنی نوع انسان کیلئے سرچشمۂ ہدایت ہے اور اس میں انسان کی فلاح و نجات کا راز مضمر ہے۔ اسی سبب کے تحت اقبال دنیا میں رائج تمام ازموں میں موجود خامیوں اور خرابیوں کا ازالہ قرآن اور اسلام سے کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

صد جہاں باقی است در قرآن بنوز　　اندر آتش یکے خود را بسوز

(یعنی قرآن مقدس میں ابھی سینکڑوں جہاں (حروف و معانی) زندہ اور باقی ہیں۔ اس کی آیات کی گہرائیوں کو کھنگالنے کیلئے خود کو مشقت میں ڈال کر تو دیکھو)۔

مشرق اور مغرب دونوں میں مروج خامیوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے علامہ انہیں نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ دعوتِ مبارزت دیتے ہیں۔ وہ دونوں کو اپنی فرسودہ مکر آمیز اور ظاہر پرست اقدار میں تبدیلی لانے کی تاکید کرتے ہوئے دونوں کے حق میں یہ دلی آرزو رکھتے ہیں کہ دونوں خدا اور اس کی فعال تخلیقیت، اس کی لامحدود اور بے انتہا صفتِ سخاوت و بخشش اور سب سے بڑھ کر اس کی پاک وحدت کو اختیار کریں، اس کا اتباع کریں۔ اس جہاں میں ہنوز رائج متضاد اور متصادم نظریات، نسلی امتیازات، اور ہر طرح کے تعصّبات نوعِ انسان کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔ حقیر مقامی اور متعصّبانہ خیالات، عظیم مقام و مرتبہ کے حامل، انسان کے شایانِ شان نہیں۔ اس چھوٹے سے جہاں سے ماوراء ایسے کتنے ہی جہاں ہیں جنہیں نوعِ انسان باہم متحد ہو کر مسخر کر سکتی ہے۔ نوعِ انسان کا یہ متحد ہونا انسان اور انسانیت کی ترقی اور بقا کا ضامن ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اقبال کے نظامِ فکر میں ایک سلسلۂ امتزاج قائم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہاں مادیت اور روحانیت، سیاسیات اور اخلاقیات، عقلیت اور وجدان ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ یہ دونوں باہم پیوست اور ہم آہنگ ہیں۔ دورِ حاضر کا انسان سائنس کی مادی حقیقتوں اور علمی معجزات کا غلام ہو کر ان سے اس قدر خیرہ ہے کہ روحانی اقدار، روحانی معجزوں اور نادیدہ حقیقتوں پر اُس کا ایمان و ایقان بے حد کمزور اور متزلزل ہو چکا ہے۔ مادی ترقی کے نتیجے میں انسان کو راحت اور آسائش بہم پہنچانے والے وسائل ناگزیر ضرور ہیں لیکن اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے کہ انسان جن دو چیزوں کا مرکب ہے وہ ہیں مادہ اور روح۔ جسم کی بہتر نشوونما اور ترقی کے پہلو بہ پہلو رُوح کی تسکین و اطمینان کا سامان میسر ہونا حیاتِ انسانی میں اعتدال اور توازن قائم کرنے کیلئے انتہائی لازمی ہے۔ جہاں مادّی آسائشوں کا جال انسان کو روحانی حقائق سے بیگانہ اور برگشتہ کر کے اُسے غیر آسودہ کر کے چھوڑتا ہے وہاں روحانیت ہی اس کے لئے تسکینِ قلب کا کام انجام دیتی ہے۔ ایسے میں اقبال کے بخشے ہوئے حیات بخش پیغام کی بے پناہ اہمیت بنتی ہے، جنہوں نے کائنات اور انسان کے باہمی رشتے کی اصل حقیقت، اس دنیا میں انسان کی تخلیق کے بنیادی مقصد اور زندگی کے مخفی اسرار و رموز پر غور و فکر کرتے ہوئے لازوال کارنامہ انجام دیا۔

اقبال فلسفۂ خودی کے پیغامبر ہیں۔اس پیغام کی رُو سے مشرقی اقوام کو بالخصوص اور بنی نوع انسان کو بالعموم اپنی ذات کے تعین اور احساس نفس کو پیدا کرنا اُن کا مقصود تھا۔اپنی ذات کا تعین کئے بغیر اور اپنی صلاحیتوں کی شناخت اور اُنہیں بروئے کار لائے بغیر انسان کو مقامِ انسانیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس طرح حرکت وعمل کے بناء انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ادھر بعض مکاتیب فکر نے انسان کی خودی کو حقیر قرار دے کر اسے شعور انسانی کے فریب محض سے تعبیر کیا تھا۔چنانچہ اسے مارنے اور ذاتِ خداوندی میں اُسی طرح مدغم کرنے کی تعلیم دی گئی تھی جس طرح قطرہ سمندر میں گر کر اور اس کے ساتھ ایک ہو کر اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔بقول مرزا غالب ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لیکن اقبال نظریۂ فنا کو یکسر مسترد کر کے انسان کی بقاء کے قائل ہیں۔وہ انسان سے اپنی خودی کو پہنچاننے اور اس کی نشوونما اور تربیت کیلئے اسے استحکام بخشنے کی تعلیم دیتے ہیں۔انہوں نے خودی کی تربیت کے تین مرحلے تجویز کئے ہیں (۱) اطاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الٰہی۔خودی کو عشق کی بدولت مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ خودی کے استحکام اور صلابت کے تئیں انسان کا حرکت وعمل اور سعیٔ پیہم فقط انسان تک محدود نہیں بلکہ علامہ اسے تمام تر جاندار اشیاء (living organism) کے ارتقاء میں صاف طور پر ظہور پذیر دیکھتے ہیں ؎

ہر ذرّہ ہے محوِ خود نمائی ہر ذرّہ شہید کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

خطروں سے نبرد آزما ہو کر اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا نام حقیقی زندگی ہے۔چنانچہ خطر پسندی اقبال کو اس قدر عزیز ہے کہ وہ جناب خضر کو بھی سکندر کی زبانی کارزار حیات میں خاموش تماشائی بنتے دیکھ کر اس میں عملی طور پر کود پڑنے اور سوز وساز بحر وبر میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ستیز کے اندر حیاتِ جاودانی مضمر ہے۔خطرات سے کھیل کر ہی انسان کے ممکنات کو پرکھا جاسکتا ہے ورنہ زندگی میں پیش آنیوالے خطروں سے دور رہنے میں عافیت سمجھنے سے انسان کی مخفی صلاحیتوں کے زنگ آلودہ ہونے کا اندیشہ یقینی ہے۔زندگی کی اس ٹھوس حقیقت کے پیش نظر اقبال انسان کو استحکام اور صلابت کے حصول کیلئے الماس اور پتھر کی سی سختی اختیار کرنے کی پُر زور تلقین کرتے ہیں۔

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدر یا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

کائنات کے بارے میں یہ خیال بالکل صحیح نہیں کہ یہ پہلے سے تکمیل شدہ ہے اور اس میں کسی مزید توسیع اور اضافے کی گنجائش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات برابر نشوونما اور ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہوئی اپنے اندر توسیع اور اضافے کے امکانات اور گنجائش رکھتی ہے۔ اسی طرح انسان کو زندانی تقدیر یا پابند تقدیر قرار دیتے ہوئے کوشش اور جدوجہد کو لایعنی اور بے سود سمجھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں، لیکن اقبال انسان میں بے پناہ توسیع، امکانات اور ترقی کے منکر کے لئے یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہوئے اُس کی ترقی اور تکمیلیت کے راستے یہ کہتے ہوئے کھول دیتے ہیں ؎

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے
گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

تکمیلیت کے مراحل سے گزرتی ہوئی یہ کائنات انسان کی تخلیقی سرگرمیوں اور قوتوں کے لئے وسیع میدان فراہم کرتی ہے، جس کی رُو سے وہ ایک طرف فطرت پر تسخیر پا رہی ہیں اور دوسری جانب اس کی اپنی قوتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا رہی ہیں۔ انسان خدا کی تخلیق کی ہوئی کائنات میں اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لا کر اس میں حسن، ترتیب اور افادیت پیدا کر کے خدا سے اپنے رول کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال نے اُن تمام افکار و خیالات کو مسترد کر دیا ہے جن کی رُو سے انسانی ذہن کی صلاحیتوں کو محدود قرار دیکر اسے خارجی قوتوں کے انجذاب و انضمام کے نااہل قرار دیا گیا ہے۔ اقبال ذہنِ انسانی کے اپنی نوعیت میں لازمی طور پر موافق یا Assimilative ہونے کے قائل ہیں۔ خدا اگر خالق ہے تو انسان بھی ایک طرح کا تخلیق کار ہے۔ اُس کے اندر خوابیدہ صلاحیتوں، استعداد اور سب سے بڑھ کر جذبۂ عشق، جو فقط اُسی کا خاصہ اور امتیاز و انفراد ہے، کی بناء پر اُس کا مقام و مرتبہ افضل و اولیٰ ہے اور اس میں بعض امتیازی خصوصیات کے سبب فرشتوں پر بھی سبقت حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے — زمین از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اقبالؔ اور فیضؔ

یوں تو ہر بڑا شاعر اپنی مخصوص انفرادیت اور تخصیص کی بناء پر اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے اوراس کی اپنی ایک شناخت ہوتی ہے۔تاہم بڑے شعراء اپنی روایات سے ہرگز انحراف نہیں کرتے۔وہ روایت سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کرتے ہیں۔حکیم الامت علامہ محمد اقبال اور فیض احمد فیض دونوں نے اپنی ادبی روایت سے اکتساب فیض کر کے اپنے اپنے دور کی تکمیل کی۔اقبال کا مولد سیالکوٹ ہے اور فیض کو بھی اپنے اسی مولد سیالکوٹ پر افتخار حاصل رہا ہے۔اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء مقرر کی گئی ہے اور فیض ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔علامہ اقبال سے فیض کی نسبت کے کئی پہلو ہیں۔دونوں ہم وطن و ہم عصر تھے۔اقبال اور فیض کے والد کی آپس میں دوستی تھی۔دونوں بیرسٹر تھے،دونوں ساتھ ہی لندن سے لوٹے تھے۔فیض کے والد گرامی سلطان بخش جو بڑی محنت کے بعد ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تھے،علامہ اقبال سے نیاز رکھتے تھے۔فیض اقبال سے عمر میں ۳۳۔۳۴ برس چھوٹے تھے۔وہ اقبال کو ''چچا'' کہتے تھے۔فیض نے اقبال کو پہلی مرتبہ نہایت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا،ہوا یوں کہ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ نے سالانہ جلسے کا انعقاد کیا۔اس جلسے میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال کو غالباً مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔جلسے میں فیض سے تلاوت کلام پاک کا فریضہ انجام دلوایا گیا۔فیض نے اس فریضہ کی انجام دہی کے بعد علامہ سے داد و تحسین حاصل کی۔خود فیض کے الفاظ میں ''میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کیا گیا۔جب میں تلاوت کر چکا تو اقبال نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔تم کتنے ذہین اور اچھے بچے ہو۔''

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب فیض گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہونے لگے تو فیض، قاضی فضل حق صاحب کے لئے علامہ کا خط لے کر گئے۔فقیر وحیدالدین کے الفاظ میں ''اس موقعے پر انہیں (فیض کو) علامہ اقبال کی تائید و معاونت حاصل تھی۔'' انٹرویو ختم ہونے کے بعد فیض نے قاضی صاحب سے علامہ کا خط لوٹانے کی درخواست کی لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔علامہ کا خط

واپس نہ ملنے کا فیض کو افسوس رہا۔ کالج میں داخلے کے سلسلے میں اقبال سے معاونت حاصل کرنے میں یہ اقبال سے فیض کی مختصر سی ملاقات تھی۔ پھر اقبال غالباً ۱۹۳۰ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور اور کئی انجمنوں کی جانب سے علامہ اقبال کو ایک مشترکہ استقبالیہ دیا گیا۔ ظاہر ہے اس موقعے پر بھی فیض اقبال کو روبرو دیکھنے اور ان سے مختصر سی ملاقات سے مشرف ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور ہی کے زیر اہتمام سالانہ مشاعرے میں اقبال کے موضوع پر ایک شعری مقابلہ ہوا تھا جس میں انعام فیض کو ملا۔ کے۔ کے۔ کھلر اس ضمن میں لکھتے ہیں۔ ''گورنمنٹ کالج لاہور کے مشاعرے میں جب فیض نے پہلی بار اپنی نظم پڑھی تو علامہ اقبال نے ان کو بلایا اور شاباشی دی''۔ بعد میں فیض کو وقتاً فوقتاً اقبال کی خدمت میں اس دور کے مشاہیر کی معیت میں حاضری کے مواقع ملتے رہے۔ کبھی ایم۔ ڈی۔ تاثیر کے ہمراہ، کبھی صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے ساتھ اور کبھی عبدالمجید سالک کے ساتھ۔ اقبال اور فیض کی شخصیت اور شاعری میں چند پہلو قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ دونوں نے روایت اور کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کر کے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور اپنا ایک مخصوص اور منفرد لب ولہجہ اور جہانِ معانی آباد کیا ہے۔ دونوں انسان دوست ہیں، دونوں کا تسخیر فطرت پر زور رہا ہے۔ گرچہ اس معاملے میں دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔ فیض اقبال کی برگزیدہ شخصیت سے عقیدت رکھتے ہوئے اپنے آپ کو اقبال کا نیاز مند تصور کرتے تھے۔ بقول کے۔ کے۔ کھلر ''وہ (فیض) اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعری میں وہ ان کی خاک پا بھی نہیں، علامہ بہت بڑے شاعر تھے''۔ فیض اقبال کے نہ صرف مداح تھے بلکہ انہوں نے ان سے خاصا اثر قبول کرنے کا اعتراف بھی بہت بار کیا ہے۔ وہ ان کے زبردست معتقد بھی تھے بلکہ ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اقبال کا ایک انتخاب مع طویل دیباچہ شائع کریں۔ ان کے نزدیک اسلام اور دوسرے بنیادی سوالات پر علامہ کے اصل نظریات ان کی انگریزی تحریروں میں موجود ہیں، غالباً ''اسی وجہ سے انہوں نے ان خیالات کو انگریزی میں قلمبند کیا تا کہ وہ رجعت پسندوں کی دسترس سے باہر رہیں، گو کہ اب رجعت پسندوں کی اکثریت ہمارے یہاں انگریزی بولتی ہے۔ علامہ سے اثر پذیری اور دونوں بڑے شعراء کے خیالات میں مماثلت اور مطابقت کا اعتراف عصرِ جدید کے کئی اہل فکر ونظر علماء بھی اکثر کیا کرتے ہیں۔ ایک اہلِ نظر نے لکھا ہے:

> ''فیض کی شاعری کا بیشتر حصہ تشکیک کا نہیں بلکہ علامہ اقبال کی شاعری کی طرح اپنے مسلک کی صداقت پر یقین اور اس کی برتری کے احساس کا آئینہ دار ہے۔ یہی یقین اور برتری کا احساس فیض کو ہر حالت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔''

اقبال نے غالبؔ، جوان کے پیشرو تھے، کی طرح غزل کے فارم کے اندر رہ کر بہت سے تجربات کئے۔ اس میں اقبال کی بدولت فلسفہ اور حکمت وغیرہ در آئے۔ فیض نے بھی اقبال کی طرح غزل کو ترک نہیں کیا۔ اقبال ہی کی طرح غزل کے فارم میں نئے تجربے کئے اور نئے مضامین نظم کے رنگ میں باندھے۔ تاہم اس کی اولیت کا سہرا فیض کے نزدیک غالب اور اقبال کے سر ہے۔ اور بقول اُن کے انہوں نے (فیض نے) غالب اور اقبال کی پیروی کی ہے۔ فیض غزل کے میڈیم کو خوبصورت قرار دیتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے تحت اس میں تغیر و تبدل کو لازمی سمجھتے ہیں۔ غزل میں غالب اور اقبال کی بدولت رونما ہوئے انقلاب کا فیض کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اقبال کی عظمت کے قائل ہیں۔ ان دو بڑے شعراء سے اکتساب فیض کا اعتراف انہوں نے نہایت صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے۔ فیض نے شمس العلماء مولوی میر حسن سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے چھوٹی عمر میں حفظ قرآن کی ابتدا کی تھی اور کئی پارے حفظ بھی کئے تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بھی بہرہ مند تھے، ان کی شاعری میں انسان دوستی، عظمتِ انسان، عدل و انصاف، جبر و استحصال کی مذمت اور اس کے خاتمے کے لئے کوششیں، حریت انسانیت، ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج' یہ تمام پہلو ایسے ہیں جن پر اسلامی تعلیمات کے بھی خاصے اثرات ہیں اور یہ اثرات اقبال اور فیض دونوں کے یہاں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔

فیض کو اقبال کی شاعری سے گہری محبت رہی ہے۔ انہوں نے ادارۂ یادگار غالب کراچی میں اقبال پر جو تقریر کی تھی وہ ان کے ذہن و شعور اور علامہ کے تئیں ان کی سوچ اور رویئے پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے اس تقریر میں اقبال کے فکری ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے یہاں بتدریج تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری کے ہر دور میں تفکر و تدبر اور تجسس و تلاش کا عنصر نظر آتا ہے، فیض نے مضامین کے اعتبار سے اقبال کے غنائی دور کے تین عناصر کا ذکر کیا ہے۔ (۱) عنفوان شباب کے عاشقانہ جذبات (۲) مناظر فطرت (۳) حب وطن اور قومیت۔ فیض نے اقبال کے قیام انگلستان کے دوران کہی گئی نظموں میں اداسی اور تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ اس دور میں اقبال نے سب سے زیادہ توجہ مسدس پر دی ہے اور شکوہ، جواب شکوہ 'شمع و شاعر' اور خضر راہ وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔ فیض اقبال کے دور سوم کو ان کے پختہ کلام سے تعبیر کرتے ہیں جس کی ذیل میں بال جبریل' اور ضرب کلیم جیسے مجموعے آتے ہیں۔ تیسرے دور میں پہلے دو ادوار کی نسبت اقبال کے یہاں نمایاں تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے فیض کہتے ہیں کہ زبان بدل جاتی ہے لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے فکر کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے لیکن موضوعات کا دائرہ سمٹتا جاتا ہے۔ تیسرے دور میں اقبال کے یہاں جو رویہ کارفرما نظر آتا ہے اس کا

ذکر کرتے ہوئے فیض کہتے ہیں کہ تشبیہات واستعارات کا برتاؤ کم ہوتا ہے۔ سیدھی زبان اور اختصار کے علاوہ اپنا سر اونچا رکھنے اور سامع پر صحیح تاثر قائم کرنے کے لئے اقبال نے کئی نسخے استعمال کئے ہیں جن میں سے صرف دو تین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال نے دلی، سمرقند، دجلہ، فرات، عراق اور اصفہان جیسے اسمائے معارفہ استعمال کئے۔ فیض کے الفاظ میں ''ان سے ایک اپنی فضاء وابستہ ہے۔ ہمارے ذہن میں زمان ومکاں کی وجہ سے ایک خاص قسم کا روحانی نقشہ پیدا ہوتا ہے۔'' فیض کے نزدیک اس دور کی لغت پہلے سے مختلف ہے اب اقبال ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پوری طرح متروک نہیں لیکن ان کا استعمال میں آنا بند ہو گیا تھا۔ جیسے برگ نخیل، رحیل کارواں، رنگ برنگ طیلسان، ان غیر مستعمل الفاظ کو اقبال نے دوبارہ رائج کیا۔ تیسری چیز غزل میں ان کا آہنگ اور ترنم کا انداز ہے۔ بال جبرئیل کے زمانے میں ان کا زیادہ زور غزل ہی پر ہے۔ اور اقبال کی سب سے اچھی غزلیں اسی دور کی ہیں۔ ان میں انہوں نے ردیف ترک کر دی۔ بہت سی اچھی غزلیں بنا ردیف کے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے لیکر کے پہلی جنگ عظیم کے اختتام بلکہ ۱۹۳۰ء تک چلتا ہے۔ علامہ نے اسرار ورموز سے اپنی فارسی گوئی کی ابتدا کی۔ کوئی پچیس تیس برس تک اردو میں مشق کرنے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جو مقام پیدا کیا وہاں سے فارسی شاعری کا آغاز کرتے ہیں، فیض کی نگاہ میں اقبال کی شاعری کا پہلا دور غنائیہ دور کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے دور کو خطیبانہ وواعظانہ قرار دیا ہے۔ اس دور میں پہلے دور کے مقابلے میں کئی چیزیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے اب ذات اور قوم کی بجائے خیال کے دائرے میں ملت اور اقوام مشرق داخل ہو جاتی ہیں۔ مناظر فطرت کی جگہ معاشرتی اور سیاسی مسائل لے لیتے ہیں۔ اسی دور میں آقا ومزدور، خواجہ اور غلام، حاکم اور اقوام، آزادی اور غلامی کا ذکر کرتے ہیں۔ مناظر فطرت پر توجہ کرنے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ان کی نظر سیاسی، معاشرتی اور انسانی معاملات پر جم جاتی ہے۔ ان کی فکر اب ذات اور وطن کی بجائے ملت اسلامیہ اور مختلف محکوم ملل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اس دور میں غالب کی مغلق زبان اور داغ کی روزمرہ کی زبان کے امتزاج سے اپنی زبان بنائی۔ اصناف سخن میں انہوں نے غزل کو ثانوی حیثیت دی۔ مختصر نظمیں اسی دور میں بھی کہی ہیں مگر انہیں کوئی اولیت اور ترجیح نہیں دی۔ اس دور میں ان کا زور مسدس پر ہے۔ فقط مسدس ہی خطیبانہ اور واعظانہ کام کے لئے سب سے موثر اور مناسب پیرائیہ اظہار ہے۔ فیض نے میر انیس کو مسدس کہنے والوں کا قافلہ سالار کہہ کر ان کی اس خدمت کو سراہا ہے۔ اقبال نے اُردو کی غیر مروج یا نامانوس بحریں استعمال کیں۔ مسجد قرطبہ کی بحر اردو میں کم استعمال ہوئی ہے۔ اقبال نے چند اور نظموں میں غیر مستعمل بحور کا استعمال کیا ہے۔

فیض کو Globe trotter یا جہاں گرد قرار دیا گیا ہے وہ جہاں بھر میں گھومے پھرے تاہم بھوپال شہر انہیں بے حد پسند تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہاں شاہوں والا استقبال ہوا کرتا تھا بلکہ اس سبب کے تحت کہ اس شہر نے علامہ کے آخری ایام میں ان کے ''چچا'' اقبال کی بیماری' تیمارداری اور میزبانی کے اخراجات اٹھائے ہیں۔ فوج میں ملازمت کے دوران ایام میں فیض بھوپال بھی گئے۔ اقبال کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ آخری عمر میں سوشلسٹ ہو گئے تھے اس وجہ سے بھی علامہ فیض کی نگاہ میں محترم و مکرم تھے۔

فیض جس زمانے میں امرتسر کے کالج میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے انہیں ایام میں اقبال کا انتقال ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ فیض کلاس میں طلباء کو پڑھا رہے تھے کہ کسی نے یہ دکھ بھری خبر انہیں دے دی۔ وہ سیدھے لاہور پہنچے۔ علامہ کے انتقال پر فیض نے بعد میں ایک نظم لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوشنوا فقیر — آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں — ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھی چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں — پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما — اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند ایک کو یاد ہے اس کی ادائے خاص — دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

علامہ کو فیض کے پیش کئے ہوئے خراج عقیدت کو کے، کے، کھلر نے ''نہایت ہی پنجابی قسم کے خراج عقیدت'' سے تعبیر کیا ہے۔ فیض اقبال کی وسعت فکر و نظر کے قائل ہیں۔

''اقبال کو کسی تحریک کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک قدم پرانے وطن پرستوں میں ہے اور دوسرا موجودہ ترقی پسندوں میں، قوم اور وطن کے بعد انقلاب اور مزدور اور سرمایہ کا جو دور آیا اس کی بھی پہلی جھلک ان ہی کے ہاں دکھائی دیتی ہے''۔

ایک انٹرویو میں جب فیض سے ٹی، ایس، ایلیٹ کے اس خیال کو ظاہر کیا گیا کہ ندرت تکرار سے بہتر ہے تو انہوں نے تکرار میں حسن کے عنصر پر زور دیتے ہوئے کہا:

''تکرار سے تو ہر چیز بہتر ہے۔ آپ اقبال کی مثال لیں۔ ان سے زیادہ تکرار کس کے یہاں ملتی ہے مگر اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا، تکرار کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ مکھی پر مکھی مارتے چلے جائیں اور دوسری یہ کہ آپ ایک پرانے مضمون کو اس طرح آگے بڑھائیں کہ اس میں حسن پیدا ہو جائے اور تکرار باقی نہ رہے۔''

فیض اقبال پر ایک فلم بنانے کے شدید خواہاں تھے لیکن بتایا جاتا ہے کہ سردار جعفری بازی لے گئے اور جگن ناتھ آزاد دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، نیز فیض اقبال پر لکھنا چاہتے تھے۔ ان کے جو تین کام نامکمل رہ گئے ان میں سے ایک کام اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب لکھنا بھی شامل تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ فیض اقبال پر یہ کتاب لکھ رہے تھے۔

ا۔ مزید دو ادھورے کام یہ ہیں (۱) اُردو شاعری کے ایک انتخاب کی ترتیب (۲) پاکستانی کلچر پر اُردو اور انگریزی میں ایک کتاب (یہ کتاب بھی فیض لکھ رہے تھے)

اقبالیات

(مجلّہ اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی) شمارہ ۱۹، ایک جائزہ

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے زیرِ اہتمام شائع شُدہ اقبالیات کا اُنیسواں شمارہ چودہ مضامین پر مشتمل ہے۔ مذکورہ مجلّہ کے مدیر ادارہ کے سابق ڈائریکٹر جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ابتدا میں تمہید کے طور پر ''گفتنی'' عنوان کے تحت عصرِ جدید میں علم و ادب اور عقل و دانش کے پیشِ نظر اقبال کی معنویت اور اُن کے دئے ہوئے پیغام کو خاصی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مادّی کشمکش کے حالات میں کلامِ اقبال ایک روحانی موجب کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاّمہ کے حوالے سے دورِ جدید میں عقل و دانش کے ساتھ ساتھ روحانیت کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے نمائندگانِ اقبال سے اُن کے آفاق گیر احترامِ آدمی کے نظرئے کو عام کرنے کی خاطر عملی کوششیں کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مجلّہ کے فہرست مضامین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جہاں تک مقالہ نگار حضرات کا تعلق ہے۔ اُن میں سے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور الطاف انجم وغیرہ کے علاوہ بقیہ تمام کا تعلق براہِ راست اقبال اسٹڈیز سے ہے۔ بعض نے اقبال پر تحقیق کر کے مبسوط کتابیں لکھ اقبالیاتی حلقوں میں خاصا نام پیدا کیا ہے۔ جب کہ بعض نے اقبال اور اُن کی فکر کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

بہر حال مجلّہ میں شامل پہلا مقالہ ''اقبال اور عشقِ رسولؐ (شاعری کے تناظر میں) اقبال پر لکھی ہوئی عمدہ کتاب ''شعریاتِ اقبال'' کے مصنف پروفیسر قاضی عُبید الرحمٰن ہاشمی کا ہے۔ جس میں علاّمہ کے یہاں نعت کی عربی اور فارسی روایت سے استفادہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس موضوع کے تئیں اُن کے مختلف انداز اور تخصیص کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

''انہوں نے (علاّمہ نے) معروف معنی میں نعتیں لکھنے کے بجائے اور محض ایک نعت گو کی

حیثیت سے کوئی امتیاز حاصل کرنے کے بجائے اپنی تمامتر تخلیقی وشاعرانہ صلاحیتوں کو اُس عظیم مقصد کے حصول کے لئے وقف کردیا جو بعثتِ رسالت کا اصل منشاء تھا''۔

مقالے میں علّامہ کے دور کے اُن نامساعد حالات کی جانب بھی قارئین کرام کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے جن کے زیراثر اُنہوں نے فرد اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا، اور امراض کی تشخیص کر کے علاج کے لئے نسخے بھی تجویز کئے۔ ہاشمی صاحب نے اقبال کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت کو آنحضورؐ کے تئیں علامہ کے بے پناہ عشق اور عقیدت پر منحصر قرار دیا ہے۔ یوں تو اقبال اور عشقِ رسولؐ پر ڈاکٹر طاہر فاروقی کی تصنیف ''اقبال اور محبت رسولؐ'' کے علاوہ محمد عبداللہ خاور کے ترتیب دئے ہوئے اقبالیاتی اشاریئے ''مفتاحِ اقبال'' میں اِس موضوع پر تحریر کئے گئے مقالات کی فہرست سے صاف ظاہر ہے کہ کلام اقبال کا یہ پہلو کوئی اچھوتا پہلو نہیں ہے، تاہم ہر تحریر کی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے بشرطیکہ اُس میں کوئی خاص بات ہو۔ اِسطرح مذکورہ موضوع کے حوالے سے جو باتیں پہلے کہیں کہیں اشارتاً بیان کی جاچکی ہیں، پروفیسر ہاشمی نے نہایت عمدگی اور سلیقے کے ساتھ اُن میں استعیاب پیدا کرنے اور اپنی طرف سے ان میں قابل قدر اضافہ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

دوسرا مضمون پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کا ''اقبال ...... ایک دانشِ نورانی'' کے عنوان سے ہے۔ دانشِ نورانی کی ترکیب اقبال ہی کی ایک غزل کے مطلع[۱] سے ماخوذ ہے۔ مضمون میں اقبال کے حوالے سے دانشوری کی دو ۲ قسموں، یعنی دانشِ نورانی اور دانشِ بُرہانی کے معنی بتا کر حدیث کی رُو سے مومن کی دانشمندی سے خائف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ مومن اشیاءَ وعناصر کا مشاہدہ انوارِ الٰہی سے کرتا ہے۔ یہ دانشِ نورانی ہی ہے جس کے نتیجے میں اِنسان کو ؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ، کے بلند و بالا مقام پر فائز کیا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں صاحب مضمون نے اقبال کی فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' سے وہ مکالمہ بھی درج کیا ہے جو زندہ رود یعنی خود اقبال کے اور شہیدِ عشقِ الٰہی حسین ابن منصور حلاّج کے مابین ہے۔ پروفیسر نحوی صاحب لکھتے ہیں:

''اقبال کے پورے کلام میں دانش نورانی کے مظاہر ۔۔۔۔ کہیں ۔۔۔۔ صحابۂ کبار کے جذبۂ قربانی، آلِ نبی کی صداقت وشجاعت، اولیاءَ ومشائخ کے قصص وواقعات اور معرفتِ ذات کے نمائندوں کی سیرتِ پاک سے مزیّن ہے''۔ (ص ۱۲)

۱۔ اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

دانشوری کی دوسری قسم دانشِ بُرہانی کو منطق، عقل، استدلال، محبت، دلیل، علم اور خبر کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ اقبال دانشِ بُرہانی کی اہمیت کے ہرگز منکر نہیں لیکن جب یہ انسان کو تشکیک، ارتداد، الحاد اور اقدار سے بیزار کر دیتے ہیں تو علامہ اِسے کورذوقی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ دانش برہانی کے تذکرے کے ضمن میں آخر میں دانش فرنگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے صاحب مضمون نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تصنیف ''فکر اقبال'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ لیکن نقل کئے گئے اقتباس میں درمیان میں حذف کی گئی عبارت کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ اور حوالہ اور متن میں حدِ فاصل قائم نہیں کیا جا چکا ہے۔ اِس کے علاوہ کہیں کہیں الفاظ میں بھی ردو بدل کیا گیا ہے۔ بہر کیف مضمون نگار اپنے خیالات کی ترسیل اور ابلاغ میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

''اقبال کی شخصی شاعری'' اُردو افسانہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ارتضٰی کریم کا تحریر کردہ مضمون ہے، جس میں اقبال کی شخصی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے نزدیک شخصی نوعیت کی نظمیں لکھنے سے اقبال کا ایک مقصد قومی یک جہتی کے تصور کو عام کرنا بھی تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''چونکہ علامہ کو حُب وطن کا بھی احساس زیادہ تھا ورنہ

؎ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

یا

؎ ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اُس کو امامِ ہند

جیسے اشعار اُن کی نظموں میں نہیں ملتے''۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا یا ترانہ ہندی کو اقبال کی حُب الوطنی پر محمول کرنا یقیناً صحیح ہے۔ اور اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اقبال زندگی بھر اپنے وطن سے محبت کرتے رہے۔ لیکن واضح رہے کہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اُنہوں نے جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر چین و عرب ہمارا، سارا جہاں ہمارا کہہ کر اس تصور کو غیر معمولی وسعت دے کر آفاق گیر کر دیا۔ تخصی نظموں کی ذیل میں ڈاکٹر موصوف جرمن حکیم فیڈرک نطشے اور اُن کی تصانیف کے نام لے کر کسی مصنف کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''اقبالیات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے نطشے کا مطالعہ ناگزیر ہے، کیونکہ

اقبال کے مردِ مومن کا تصور نطشے کے فوق البشر Super man سے مستعار ہے۔ علامہ اقبال نے مردِ مومن کو اپنے مخصوص نظریات اور مذہب کے حوالے سے اپنا رنگ و رُوپ دیا ہے اور اُس کے خدوخال اُجاگر کئے۔ لیکن اس کے پس منظر میں نطشے کا ہی فوق البشر دکھائی دیتا ہے"

اقبال کے مردِ مومن کو موضوع بحث بناتے ہوئے جرمن مفکر فیڈرک نطشے کے "Superman" یا فوق البشر کا اکثر و بیشتر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے اقبال کے مردِ مومن کو نطشے کے "Superman" سے مستعار قرار دے کر غچا کھانے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ عرض یہ ہے کہ اِنسان کامل کا تصور سب سے پہلے شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی نے پیش کیا۔ اس کے بعد سید عبدالکریم الجیلی نے "الانسان الکامل" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اس تصور کو مزید وسعت دی۔ اقبال نے الجیلی پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جسے بعد میں ان کی تصنیف The development of metaphysics in persia[1] کے اُردو ترجمے "فلسفۂ عجم (جو میر حسن الدین نے کیا ہے) میں شامل کیا گیا ہے۔ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف "اسرار خودی" کی ایک حکایت "حکایت الماس و زغال" کے تحت کہے گئے اشعار کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے نطشے کے خیالات سے متاثر قرار دیا ہے۔ اقبال پر کام کرنے والے اسکالر یا علماً، جو فلسفے کے مضمون پر بھی خاصی دسترس رکھتے ہیں، نے اقبال اور نطشے کے یہاں مردِ کامل اور Superman کے حوالے سے دونوں میں جزوی مماثلت کا ضرور اعتراف کیا ہے، مثال کے طور پر دونوں حصولِ قوت پر خاصا زور دیتے ہیں، لیکن نطشے حصولِ قوت کے کمزوروں پر غلبہ پانے اور مذہب و اخلاق سے عاری فلسفے کا داعی ہے۔ نطشے خدا کے مر چکنے (نعوذ باللہ) کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ اقبال حصول قوت کو قانون الٰہی کا پابند رکھنے اور اسے نوعِ انسان کی خیر اور فلاح کے لئے کام میں لانے کا قائل ہے۔ وہ مذہب اور اخلاق کی سختی سے پابندی کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر نطشے کے یہاں قاہری ہے جبکہ اقبال کے یہاں دلبری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ دونوں کے فکر میں جزوی مماثلت کے باوجود دونوں کے راستے جُدا جُدا ہی نہیں بلکہ دونوں کی منزلیں بھی جُدا جُدا ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن جغرافیائی حدود و قیود، رنگ و نسل اور زبان وغیرہ سے بالاتر ہو کر نوعِ انسان کے لئے خیر کا پیغام لاتا ہے۔ اِسلئے اُسے نطشے سے نہ تو مستعار قرار دینا صحیح ہے اور نہ ہی یہ کہنا دُرست ہے کہ اس کے پس منظر میں

۱۔ علامہ کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ

نطشے کا ہی فوق البشر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ اقبال کا مردِ مومن الجیلی کے انسان کامل سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ اقبال کے مردِ مومن کے بنیادی عناصر کی تلاش کے لئے ہمیں نطشے کی بجائے الجیلی کی طرف رُجوع کرنا چاہیئے۔

اب ذرا مضمون کا دلچسپ پہلو ملاحظہ فرمایئے۔ ڈاکٹر موصوف عام نظموں کے مقابلے میں شخصی نظمیں لکھنے کو کارِ مشکل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ کسی شخصیت پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے ادیب یا شاعر کو اُس پر بھرپور نظم کہنے کے لئے اُس کی شخصیت کو اپنے اندر جذب کرنا ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان کی حمایت میں یا اسے وزن عطا کرنے کے لئے وہ خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

بطور حوالہ دیتے ہیں۔ اس خیال سے اتفاق کرنے اور اپنے بیان کی حمایت میں درج کیا گیا مذکورہ شعر کس حد تک اپنے سیاق و سباق اور مقام و محل سے مناسبت رکھتا ہے۔ اِس پر مزید تبصرہ کئے بغیر اقبال کی نظم ''شاعر'' کا مطالعہ کرنا سُود مند ہوگا۔ یہاں فقط علاّمہ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

''مشرقی مناظر و مظاہر اور مشاہیر کا مغنّی۔ اقبال'' پروفیسر خالد حسین کا تحریر کردہ مقالہ ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک اقبال کرۂ ارض کے وہ واحد شاعر یا مفکر ہیں جن کے یہاں آثار و علایم، شعری مظاہر، فکری مفاہیم، فنی مناظر اور مشرقی مشاہیر کے حوالوں، اشاروں، کنایوں اور تلمیحوں کی کثرت آرائی اور گونا گونی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو بہت زیادہ پڑھا لکھا اور باشعور شاعر قرار دیتے ہوئے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے ذہنی افق میں وسعت اور کشادگی کے ساتھ ساتھ متعدد نئے نئے پہلو، زاویے اور ابعاد سامنے آجاتے ہیں اور فکرِ اقبال کے سلسلے میں عالمی سرچشموں میں سے مشرقی سرچشموں کی تلاش و تجسس، تعبیر و تفسیر اور علم و عرفان کا بھی بخوبی اندازہ و احساس ہو جاتا ہے۔

اگلا مضمون ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا تحریر کردہ ہے جو طب کے پیشے سے وابستہ ایک ماہر اور ادیب ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''چو مرگ آید'' پر تبصرہ کی شکل میں ہے۔ ''چو مرگ آید'' اقبال ہی کے ایک مصرع ؎ چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست[1] سے مستعار ہے۔ اِس مضمون پر تبصرہ کرنا یا اس کا جائزہ پیش کرنا گرچہ تبصرہ بر

۱۔ مصرعۂ اولیٰ ہے ؎ نشانِ مردِ مومن با تو گویم

تبصرہ یا تجزیہ بر تجزیہ کے مصداق ہے تاہم مجلّہ میں شامل ایک مضمون ہونے کے ناتے اِس پر مختصراً ہی سہی، اظہار خیال کیے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔ اصل کتاب میں مصنف نے علاّمہ کی ان تمام بیماریوں اور عوارض کی نوعیت، ان کے اسباب اور ان کے نتیجے میں علاّمہ کے ذہن، اُن کی نفسیات، اور اُن کی علمی زندگی پر مرتسم ہونے والی کیفیات اور اثرات کی تفصیل درج کی ہے جن میں علاّمہ شروع سے لیکر کے آخر تک مبتلا رہے۔ اصل کتاب سے اقتباسات نقل کرتے ہوئے تبصرہ نگار کے خیالات اور مصنف کے خیالات میں حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اصل کتاب میں کہیں کہیں عجیب و غریب فقروں اور جملوں سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ''اقبال، فردوسی، عطار، حافظ، جعفر زٹلی وغیرہ کی طرح بدنصیب نہ تھے کہ ان کو قتل کیا گیا یا مفلسی و بیچارگی کی موت مرے''۔ مبصر نے مصنف کے حوالے سے اقبال کے علمی منصوبوں بالخصوص مقدمتہ القرآن کو عملی جامہ نہ پہنانے کا سبب علاّمہ کی خرابیٔ صحت قرار دیا ہے۔ لیکن مصنف کا یہ سوال Pose کرنا کہ کیا اقبال نے بیس سال عمر کم پائی۔ یاد رہے قران کی تعلیمات کی رُو سے انسان کی موت کے وقوع پذیر ہونے میں ایک ساعت کی تقدیم یا تاخیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا شاعرِ قران علامہ اقبال پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُن کی فکری اساس میں مندرج تعلیمات کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قران ہی کے تناظر میں اقبال پر تحریر کردہ کئی کتابوں کے مصنف اور مجلّہ اقبالیات کے مستقل قلمی معاون محمد بدیع الزماں کا مضمون ''ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف'' کے عنوان سے مجلّہ کا چھٹا مضمون ہے جس میں اقبال کے اُردو مجموعۂ کلام ''بالِ جبرئیل'' کی غزل نمبر ساٹھ کے شعر ؎

تڑپ رہا ہے فلاطون میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعرف

پر قرآن کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مضمون میں اعراف کے معنی تحریر کرتے ہوئے اِس تلمیح کو سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۴۶ سے وضع کردہ بتایا گیا ہے۔ مضمون نگار کے نزدیک اقبال نے اعراف کی تلمیح اُن اصحاب یا اُن فلاسفہ اور حکماً کے لئے برتی ہے جو خرد کو اپنا رہنما بناتے ہوئے دِل میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے مقامِ اعراف پر کھڑے رہ کر تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ یونانی حکیم افلاطون کو ان فلاسفہ و حکماً کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

''منصور حلاّج کے تئیں اقبال کے فکری رویے کا تدریجی ارتقاً'' کے عنوان سے مجلّہ میں اس ناچیز کا مقالہ بھی شامل ہے جس میں شہیدِ عشقِ الٰہی حسین بن منصور حلاّج کے تئیں اقبال کے فکری رویے

کے بتدریج ارتقاء کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنے تخلیقی سفر کے ایک مرحلے پر یعنی ۱۹۱۹ء میں مولانا اسلم جیراجپوری کے نام تحریر کئے گئے مکتوب میں منصور حلاج کو اُس زمانے کے مسلمانوں کی سزا دہی میں حق بجانب قرار دینا اور بعد میں ۱۹۳۲ء میں اپنی فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں انہیں حقیقت کے جُویا کی حیثیت سے پیش کرنا، ان سے اسرار و رموز کی نسبت استفسار کرنا، ان کے جوابات انہیں کی زبانی دے دینا اور ان جوابات کا فکرِ اقبال سے ہم آہنگ ہونا، وغیرہ وغیرہ اِس بزرگ صوفی کے تئیں اقبال کے فکری رویئے کو سمجھنے میں بڑی حد تک ہماری رہنمائی کرنے پر دال ہے۔ منصور حلاج کو اس قدر غیر معمولی اہمیت تفویض کرنے کی بات اگرچہ علاّمہ نے اپنی نثری تحریروں یا کسی دوسری تصنیف میں کھُل کر بیان نہیں کی، تاہم فرانسیسی مستشرق اور منصور فہمی کے مردِ میدان لُوئی میسنان جن کی کتاب کا ترجمہ امریکی شاعر اور ناول نگار ہربرٹ میسن نے The Passion of Hallaj کے نام سے چار جلدوں میں کیا ہے، سے ۳۲ء میں پیرس میں ایک ملاقات کے دوران اس کا انکشاف کئے بغیر بھی نہ رہ سکے جو غالباً ''جاوید نامہ'' کی نسبت منصور حلاج کے حوالے سے ان کا معنی خیز اور بلیغ اشارہ تھا۔

ڈاکٹر فرید پربتی کا مضمون ''خضرِ راہ..... ایک جائزہ'' مجلّہ کے آخر میں درج ہے جس سے اقبال کے مصرع ؎ گر فرق مراتب نہ کُنی زندیقی کا الزام عائد کئے جانے کا خدشہ لاحق تھا لیکن ڈاکٹر موصوف کا مضمون مدیر کو تاخیر سے موصول ہونے کی بناء پر انہیں اس الزام سے بری کر دینے کے لئے کافی ہے۔ بہر کیف مضمون میں اقبال کی مشہور نظم ''خضرِ راہ'' کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اِسے ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، شکوہ اور جواب شکوہ کی طرح اُردو کی اہم ترین نظم قرار دیا گیا ہے۔ نظم کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال اور جوش کی منظریہ شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کی منظر کشی کو کامیاب آرٹ کی عمدہ مثال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مضمون کے اختتام پر علاّمہ کی شاعری کے عروضی پہلو کو بالعموم نظر انداز کئے جانے پر شکوہ ظاہر کیا گیا ہے۔

''فکرِ اقبال میں تدریجی ارتقاء کا ایک جائزہ'' ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کا تحریر کردہ مقالہ ہے۔ جس کی ابتداء میں مسلمانوں کے انحطاط اور مسلم اُمّہ میں روشن خیالی کے فقدان کے بنیادی اسباب کی اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے علاّمہ کے تفکر و تدبر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں اجتہاد کے سلسلے میں اقبال کے سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے پر بھی قارئین کا ذہن مبذول کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک علاّمہ کے مختلف خطبات و تقاریر، مکاتیب اور اشعار میں بعض ایسے افکار نظر آتے ہیں جو ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں اور بعض ایسے نظریات بھی ہیں جن پر مختلف اہلِ علم و بصیرت نے تبصرے بھی کئے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک اسلامی نظامِ حیات کی بقا کے لئے زندگی بھر فکری جدو جہد کرنا اور صحیح

معنوں میں کتاب وسُنت کے نفاذ (جوان کی زندگی کا ماحصل تھا) کی ترتیب، نفاذ اور تدبیر کار میں ایک فکری خلا دکھائی دیتا ہے۔ اس فکری خلا کی نوعیت کے سلسلے میں اُنہوں نے سعید اسد گیلانی کی کتاب ''دارالسلام اور مودودی'' سے ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ مضمون کے اختتام پر خطبات اقبال کے آئینے میں علامہ کے حوالے سے فکر انسانی کے مسلسل ارتقاء کو نظر میں رکھنے کی بات کی گئی ہے۔

''عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ'' میں ڈاکٹر سید مجید اندرابی نے اقبال کی فارسی تصنیف ''اسرارِ خودی'' کے ایک عنوان ''اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ'' کے تحت علامہ کے نظم کئے گئے اشعار کی تشریح وتوضیح کے ذریعے حضرت علیؓ کی حیات کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالی ہے، مضمون میں حضرت علیؓ کی زندگی کو ایک تاریخ سے تعبیر کرتے ہوئے علامہ کے اشعار کی تشریح کے پس منظر میں تاریخی واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

الطاف انجم کا مقالہ ''اقبال، تنقید اور مضمرات (مابعد جدید تناظر میں) کے عنوان سے ہے۔ مقالے میں اقبال پر ملک اور بیرونِ ملک ہوئے کام کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے شاعرانہ وجود کے تمامتر ابعاد کے ساتھ نمایاں نہ ہونے کا سبب اُردو تنقید میں اقبال شناسی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ اُردو تنقید کے مروجہ اصول اور نظریات کو قرار دیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے مغربی تنقید کے اصول و نظریات سے استفادہ کے مشورہ پر مبنی ۱۹۳۷ء میں وحید کے نام تحریر کئے گئے علامہ کے خط کو بطور اقتباس بھی درج کیا ہے۔ مضمون کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ اقبال کے تخلیقی تجربوں کی باز آفرینی پر کم ہی لوگوں نے توجہ کی ہے۔ چنانچہ اقبال کو نئے سرے سے دریافت کرنے اور عصرِ حاضر کے قاری کے سامنے متعارف کرانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

''اقبال کے تغزل کا مزاج اور معیار'' اقبال فہمی میں بدیع الزماں کی انفرادیت اور اقبال کا تصورِ کائنات، قرآن اور معراج النبیؐ کی روشنی میں بالترتیب ڈاکٹر نصرت جبین، ڈاکٹر ریاض توحیدی اور ڈاکٹر عرفان عالم کے تحریر کردہ تین مضامین کے عنوانات ہیں۔ اول الزکر مضمون میں اقبال کی غزل گوئی کو مثبت روایات کے احترام اور توسیع کے نمونے اور اجتہاد کے آئینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اقبال نے پرانے الفاظ اور تراکیب کو اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حوالوں کے اعتبار سے استعمال کر کے اجتہاد کیا۔ مضمون میں بانگ درا کو اقبال کی شاعری کا پہلا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ اقبال کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''اسرار خودی'' ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہو کر منصہ شہود پر آ گیا۔ اِس اعتبار سے بانگ درا کو اقبال کی اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ قرار دیا جاتا تو صحیح ہوتا۔

دوسرے مضمون میں ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اقبال فہمی میں بدیع الزماں کی انفرادیت کے

سلسلے میں اُن کی قرآن فہمی اور قرآنی تناظرات کا ذکر کیا ہے۔

اگلا مضمون ڈاکٹر عرفان عالم کا ''اقبال کا تصورِ کائنات، قرآن اور معراج النبیؐ کی روشنی میں'' کے عنوان سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صاحب مضمون کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اقبال کا جدید ذہن'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں عصرِ جدید میں اقبال کے فکر کی مناسبت اور اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ تسخیرِ کائنات کا فلسفہ یا نظریہ خود اقبال کے الفاظ میں اُنہوں نے قرآن سے سیکھا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن پر تفکر و تدبر کرنے پر خاصا زور صرف کرتے رہے۔ قرآن فہمی کے علاوہ آنحضورؐ کے واقعۂ معراج سے اُنہیں یہ سبق ملا کہ انسان قوائے فطرت اور عناصرِ کائنات کو مسخر کرنے اور زماں و مکاں پر غالب آنے کی اپنے اندر غیر معمولی اہلیت لئے ہوئے ہے۔

مطالعۂ اقبال کے حوالے سے ہمارے جید اقبال شناس وقتاً فوقتاً اقبال پر قرار واقعی کام نہ ہونے کی شکایت کرتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اقبال اور اُن کے فکر کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ لیکن ابھی بھی اقبال پر کام کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف زندگی کا شاعر ہے بلکہ انہیں زندگی کو صحیح سمت عطا کرنے والے شاعر کا اعزاز بھی حاصل ہے، اور جب تک اس کرۂ ارض پر اِنسان رہے گا۔ وہ سدا فکرِ اقبال سے رہنمائی حاصل کر کے مستفید ہوتا رہے گا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی[1]

اپنی اقبالیاتی تصانیف وتالیفات کے آئینے میں

احتسابِ عمل کو قانونِ الٰہی میں ناگزیر حیثیت حاصل ہونے کی بنا پر حکیم الامت علامہ محمد اقبال قانونِ قدرت کے نفاذ اور حیاتِ انسانی میں اس کی صداقت اور استناد پر یقین کامل رکھتے ہوئے اِنسان کو ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر وقت وقوع پذیر عمل کا احتساب کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس فطری اصول یا قانونِ

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی پاکستان کے وہ نامور نقاد اور شاعر ہیں جو ایک طویل مدت سے ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اُردو زبان وادب میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اِسی جامعہ سے حاصل کی۔ ڈاکٹر فراقی چھبیس ۲۶ سال تک پنجاب یونیورسٹی کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۲۰۱۰ء میں یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ اِس سے پہلے آپ پروفیسر اور چیئرمین کی حیثیت سے شعبۂ اُردو میں کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر فراقی نے اپنے تبحر علمی کے تحت قومی اور بیرون ملک کی جامعات کے علاوہ کئی بڑے اداروں میں خطبات دیے۔ مزید برآں کئی سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر کے مقالات پیش کیے۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر کے رسائل میں ان کے ڈیڑھ سو سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ۳۱ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اعزازات: فراقی صاحب کو ۱۹۹۸ء میں پرائم منسٹر لٹریری ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ۲۰۰۳ء میں پریزڈنشیل اقبال ایوارڈ سے نوازے گئے۔ دُنیا میں اقبالیات کی ترویج واشاعت کے لئے اُنہیں شیخ احمد زکی یمنی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے اُنہیں حال ہی میں Prestigious award پرائڈ فار پرمانس (Pride for Permanence) سے نوازا گیا۔

تحقیقی مشاغل: کلاسیکی وجدید شاعری، ادبی تنقید، اقبالیات، رُومیات، تقابلی ادب، غالبیات، تہذیبوں کے مابین مکالمات، ادبی تراجم ___ آپ کی تحقیق کے موضوعات ہیں۔

قدرت کا اس دُنیا میں انجام پانے والے ہر عمل پر اطلاق ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کے افق پر ایک مجتہد اور منفرد شاعر کی حیثیت سے طلوع ہونے کے باعث علامہ اقبال پر تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز اُن کی حیات ہی میں ہوا اور مرورِ ایام کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابیں، مقالات اور مضامین پر مشتمل ایک وافر اور بسیط ذخیرہ شائع ہو کر جمع ہوتا رہا، یہاں تک کہ اقبالیات نے باقاعدہ طور پر ایک مستقل شعبے کی حیثیت اختیار کر لی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا چلا جائے گا، اقبال پر لکھنے کی ضرورت بڑھتی رہے گی کیونکہ اُن کا فکر زماں و مکاں کی حدود کو پھلانگ کر آفاقی اور ابدی حیثیت کا حامل ہے۔ اقبال کے حوالے سے آج تک منصۂ شہود پر آئے سرمائے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر عمدہ کتابوں اور مقالات کے پہلو بہ پہلو ایسی کتابیں اور مقالات بھی سپردِ قلم کیے جا چکے ہیں جن میں افراط و تفریط کا عمل دخل رہا ہے، اور اقبالیاتی ادب کا ایک بڑا حصہ وہ بھی ہے جس کی نوعیت بالعموم جذباتی، ستائشی اور انتہا پسندانہ ہے۔ نیز بعض اقبالیاتی تحریروں میں فکرِ اقبال کی جانب قارئین کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے اُن کے افکار سے منفی نتائج کا استخراج کیا گیا ہے۔ اِس عمل میں شرق و غرب دونوں سے تعلق رکھنے والے مصنفین شامل ہیں۔ نتیجے کے طور پر اقبال کو مختلف انداز سے اعتراضات کا ہدف بنایا جا چکا ہے۔ حالانکہ ان اعتراضات کے جوابات نہ صرف اقبال کے افکار کا حقیقی ادراک رکھنے والے وقتاً فوقتاً دے چکے ہیں بلکہ خود اقبال اپنی تحریروں میں حقیقتِ حال کی وضاحت کر چکے ہیں۔ چنانچہ اقبال کے افکار کی تفہیم اور ان کے حقیقی مقام و مرتبے کی تعیین قدر اور مطالعۂ اقبال کو صحیح سمت دینے کی غرض سے ان کے تنقیدی جائزے کا کام ابتداً سے جاری ہے۔ اقبالیاتی ادب کی تنقید اور اس کی قدر سنجی کا مقصد اس کی صحیح سمت و رفتار کا تعین کرنا ہے، اس کی پیش رفت کا جائزہ لینا ہے تاکہ مستقبل میں اس ادب کی کارکردگی اور اس کے امکانات کو خوب سے خوب تر اور وقیع بنایا جا سکے۔

اقبالیاتی ادب کے احتساب اور مطالعۂ اقبال کے لئے سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے سب سے پہلی کاوش تفصیلی جائزے کی صورت میں عالمِ بے بدل اور اقبالیات کے شیدائی قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی تالیف ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' ۱۹۵۵ء میں اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ ان کے بعد ماہرین اقبالیات اقبالیاتی ادب کا جائزہ لیتے رہے ہیں (جستہ جستہ ہی سہی)۔ عصرِ حاضر میں پاکستان کے ماہرِ اقبال پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اقبالیاتی ادب کے جائزے لینے کا بیڑا اُٹھا کر اِسے اپنا مشن بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اُس کے تحت وہ باقاعدگی کے ساتھ اِس ادب کا جائزہ لیتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' میں اقبالیاتی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس

میں در آئے معتد تسامحات کی نشاندہی کر کے فکر اقبال کے صحیح منابع کی سمت قارئین کی رہنمائی کا کام انجام دیا ہے۔ اِس کتاب میں اقبال پر معرضِ وجود میں آئے سوانحی سرمائے عالمِ عرب اور بھارت میں ہونے والی اقبالیاتی کاوشوں اور بعض اہم کتابوں کو بھی تحقیق اور محاکمہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کی حیثیت تعارفی اور توضیحی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور تنقیدی بھی ہے۔ اسی طرح کشمیر سے ڈاکٹر بدرالدین بٹ کی کتاب ''جلعہ کشمیر اور اقبالیات'' میں اقبالیاتی ادب کا جائزہ پیش کیا جاچکا ہے۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد بھی اقبال پر کام کرنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً اقبال پر شائع شدہ تصانیف کا بھی جائزہ لیتی رہتی ہے۔

وقت کے دریا میں بے انتہا پانی بہہ جانے کے بعد یہ لازمی تھا کہ گذشتہ چار پانچ دہائیوں کے دوران اقبال پر معرض وجود میں آئے اقبالیاتی مصنفین کے کام کا بھی تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے۔ اس عرصے کے دوران ھندو پاک میں اقبال پر بہت کام ہو چکا ہے۔ جامعہ کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے زیر اہتمام کئی معتبر اور مستند اقبالیاتی مصنفین کے کام کو موضوع بنایا گیا۔ اِن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر آل احمد سرور، مصر کے اقبال شناس ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، پاکستان کے ماہر اقبالیات، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سید عبداللہ، (پاکستان کی اقبال اکادمی سے پروفیسر محمد منور بطور اقبال شناس کے نام سے زبیدہ جبین کا تحقیقی مقالہ، کتابی صورت میں شائع کیا جاچکا ہے)۔ اِسی سلسلے کی ایک اور کڑی پاکستان ہی کے عصر حاضر کے دانشور، نامور ادیب، تنقید نگار، مترجم، محقق اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں جنہوں نے اپنی گرانقدر تصانیف کے ذریعے اُردو ادب کی آبرو میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اقبالیات کے شعبے میں بھی ایک اہم اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی برصغیر ھند وپاک کی ایک نامور علمی وادبی شخصیت عبدالماجد دریابادی کی پہلودار شخصیت پر اُن کا تحریر کردہ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''عبدالماجد دریابادی'' -احوال وآثار'' (طبعِ اوّل ۱۹۹۳ء) کے عنوان سے اُن کی غیر معمولی تحقیقی کاوشوں کے پیش نظر معرکے کا کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ موصوف کا یہ مقالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی بالاشتراک نگرانی میں رقم کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے تحقیق وجستجو کا ایک اعلیٰ نمونہ فراہم کر کے محققین میں ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی دیگر علمی اور ادبی خدمات سے یہاں قطع نظر کرتے ہوئے صرف اقبالیات کے شعبے میں اُن کے انجام دئے گئے کارناموں کے حوالے سے کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔ اقبال پر اُن کی چار وقیع تصانیف ہیں (۱) جہاتِ اقبال (۲) اقبال ___ چند نئے مباحث (۳) نقدِ اقبال، حیات اقبال میں، اور (۴) مطالعۂ بیدل فکر برگسان کی روشنی میں ۔نقد اقبال حیاتِ اقبال

میں، اُن کی ترتیب دی ہوئی وہ کتاب ہے جس میں اقبال پر اُن کے معاصرین کے تحریر کردہ وہ تنقیدی مقالات درج ہیں جو اُن کی شاعری اور فکر کے حوالے سے اقبال کی حیات میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی اقبالیاتی تصانیف اور اُن پر تحریر کیے گئے دیگر مقالات میں اقبال کے تئیں نہایت سنجیدگی اور کمال ذمہ داری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اقبال پر لکھنے کے تقاضوں سے نہ صرف اُنہیں بخوبی آگاہی حاصل ہے بلکہ وہ اُن کی تکمیل کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ مند ہیں۔ فرسودہ اور پامال موضوعات سے ہٹ کر وہ زیادہ تر اقبال کی فکر کے اُنہیں پہلوؤں کو موضوع بنا چکے ہیں جن پر اُن سے قبل کم ہی لکھا جا چکا ہے۔ اور ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے فراقی صاحب کی وسعتِ علمی اور منفرد اندازِ فکر و نظر کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ڈاکٹر فراقی فارسی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں کے ادب پر نظر رکھتے ہیں، وہ اقبال کے شعری کمالات پر لکھنے کے شدید آرزومند ہیں۔ اُن کے نزدیک اقبال کی فارسی شاعری فنّی تجزیے اور تحلیل کی متقاضی ہونے کے علاوہ اُن کی دست نوشت بیاضیں (جن کی اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے کانٹ چھانٹ کی ہے اور اُن میں حک و اضافہ کیا ہے) عمیق لسانی اور فنّی تجزیے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میری آرزو ہے کہ کاش میں اقبال کے شعری کمالات پر ایک مبسوط کتاب لکھتا۔ غالب کی طرح اقبال کے لب و لہجہ پر بھی نطق سو بار ناز کرتا ہے اور اس کا متقاضی ہے کہ اس کا بھرپور اور تفصیلی جائزہ مرتب کیا جائے۔۔۔ اِس ضمن میں اُن کی فارسی شاعری خصوصیت کے ساتھ فنی تجزیے اور تحلیل کا تقاضا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے مختلف اُردو اور فارسی مجموعوں پر مشتمل ان کے اپنے حک و اضافہ اور کانٹ چھانٹ کی حامل دست نوشت بیاضیں بھی گہرے لسانی اور فنی تجزیے کی طالب ہیں''۔ [1]

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال پر پہلی تصنیف ''جہات اقبال'' کے نام سے نومبر ۱۹۹۳ء میں بزم اقبال لاہور سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اِس کتاب کا دیباچہ اُردو کے نامور ادیب اور ماہر اقبال ڈاکٹر سید عبداللہ کے لائق و فائق شاگرد جناب میرزا ادیب نے تحریر کیا ہے۔ نو مقالات پر مشتمل مذکورہ تصنیف فکر اقبال کی مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ فہرست مضامین میں بعض ایسے عنوانات بھی شامل ہیں جو اقبال کے فکری نظام میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر تصورِ الٰہ اور عبادت کا مفہوم (اقبال کے خطبہ سوم کا

۱۔ اقبال_چند نئے مباحث۔ حرفے چند۔ ص، ۸

اجمالی جائزہ) مسلم فلسفے میں زماں کا مسئلہ، جمہوریت اقبال کی نظر میں، عصری مسائل اور فکر اقبال اور علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ الثانیہ۔ ان اہم موضوعات کے علاوہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے شیخ عطاؑ اللہ کی ترتیب دی ہوئی اقبال کے مکاتیب پر مشتمل کتاب اقبال نامہ، مقبول انور داؤدی کی ''مطالب اقبال'' اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی ''مسائل اقبال'' کے تجزیاتی مطالعات پیش کیے ہیں۔ ''جہاتِ اقبال'' میں شامل مضامین ڈاکٹر موصوف نے ۱۹۸۳ء-۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصے میں تحریر کیے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ مضامین دس برس کی مدت میں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین کتابی شکل اختیار کرنے سے پہلے ھندو پاک کے بعض نامور مجلّات کی زینت بن چکے ہیں۔ ''جہات اقبال'' کے پہلے پانچ مقالات کے مطالعے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی مشکل پسند طبعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے فکر انگیز مباحث پر قلم اُٹھانے کے لئے کس قدر عمیق اور غائر مطالعے، فکر و نظر کی وسعت اور پختگی اور غیر معمولی فہم و ادراک کی احتیاج ہے، جسے اقبال کا ایک عام طالب علم نہیں بلکہ ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے متخصص اقبال ہی پورا کرنے کی استعداد سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ نئے اور تازہ موضوعات کی تلاش و جستجو کا عمل فراقی صاحب کا تخلیقی مشن رہا ہے۔ کتاب میں شامل پہلے مقالے اور خطبات اقبال کے تیسرے عنوان "The Concept of God and the meaning of Prayer" میں مذکورہ خطبے کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاچکا ہے۔ فراقی صاحب کے نزدیک علاّمہ نے اس خطبے میں تصورِ اِلٰہ پر نہایت حکیمانہ انداز میں روشنی ڈال کر تصورِ اِلٰہ اور عبادت کی مختلف جہات اور زاویوں سے وضاحت کی ہے۔ اقبال نے دُعا اور عبادت کے تصور کو بڑی خوبی اور گہرے فلسفیانہ استدلال کے ساتھ واضح کیا ہے۔ فراقی صاحب نے خطبے کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اقبال کے دقیق فلسفیانہ افکار کو اپنے ذہن رسا، غیر معمولی قوتِ ادراک اور مطالعے کی بدولت علامہ کے کلام سے حوالے دیکر اسے قابل فہم بنانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ فکر اقبال کے نہایت اہم اور دقیق مبحث مسئلہ زماں و مکاں پر، جسے وہ مسلم ثقافت کے لئے حیات و موت کا مسئلہ قرار دیتے تھے، بہت ہی کم لوگوں نے لکھنے کی جسارت کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایسے فکر انگیز موضوع پر لکھنے کے لئے مصنف سے وسعت علمی اور غیر معمولی فہم و ادراک کا تقاضا ہے۔ اِس موضوع کے حوالے سے ریاضیات کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی قابل قدر تصنیف ''اقبال کا تصورِ زماں و مکاں'' کے علاوہ بہت کم لوگوں نے لکھا ہے۔ اِن میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا اسم گرامی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ علاّمہ کے ایک غیر مطبوعہ نہایت اہم مضمون بعنوان "The Concept of Time in muslim Philosophy" کا ترجمہ کرتے ہوئے فکر اقبال کے اس پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فراقی کے

اس نامکمل غیر مطبوعہ مضمون کو خطبات اقبال میں زمان و مکاں کے مبحث کا اجمال قرار دیتے ہوئے اس کی غیر معمولی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ایک حقیقی محقق کی حیثیت سے چند تسامحات کو رفع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر خطبات اقبال میں زمان و مکان کی بحث کے دوران عراقی کا معتدد بار تذکرہ آیا ہے۔ اورینٹل کانفرنس، جو ۱۹۳۸ء میں منعقد کی گئی تھی اور جس کے لئے اقبال نے اپنا صدارتی خطبہ ''حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت'' میں بھی غایۃ الرکاں فی معرفۃ الزماں والمکاں کے مصنف کے طور پر عراقی کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر موصوف کے نزدیک عراقی اس رسالے کا مصنف نہیں بلکہ اس کے اصل مصنف محمود الاثنوی ہیں۔ اِسطرح ڈاکٹر موصوف اِس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ایک حقیقی اور ذمہ دار محقق کی حیثیت سے صحیح نام کی طرف قارئین کی رہنمائی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی ایک محقق کے فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس کی عملی اور نمائندہ مثال اُن کی تصنیف ''جہاتِ اقبال'' میں شامل طویل مضمون ''اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ چند گزارشات، چند تصحیحات'' ہے۔ مکاتیب اقبال پر مشتمل شیخ عطاء اللہ کے مرتب کردہ ''اقبال نامہ'' میں در آئی اغلاط کی نشاندہی اگرچہ محققین اقبال وقتاً فوقتاً کر چکے ہیں تاہم ڈاکٹر فراقی نے جس دقّت نظر اور محنت شاقہ سے مذکورہ کتاب میں موجود غلطیوں کی تفصیلات درج کی ہیں، وہ واقعتاً تحقیق کے محنت طلب اور صبر آزما کام کے تئیں اُن کے انتہائی سنجیدہ رویے اور جاں سوزی کے عمل کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔ یہ مضمون تحریر کرنے سے ڈاکٹر موصوف کا مقصود اقبال کے نثری متون کے حوالے سے ہوئے کام میں موجود غلطیوں کو رفع کر کے اقبال کی ہر تحریر کو قارئین کے سامنے صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ چنانچہ خطبات اقبال کے علاوہ اقبال کے تمام تر نثری سرمائے کی صحت کے لئے وہ کسی مرد مبارز طلب کے منتظر ہیں جو اسے نہایت دردمندی، جگر کاوی اور تدوین متن کے سائینسی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے انہیں از سرِ نو مدوّن کرے۔ ''جہات اقبال'' میں شامل ایک اور اہم مقالے بعنوان ''جلوہ خون گشت و نگاہے بتماشا نرسید'' کے تحت شرق و غرب یا افقی سطح پر علامہ کے حوالے سے منصہ ظہور پر آئے کام کا تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے جائزہ لیتے ہوئے جہاں اس کے بیشتر حصے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے وہاں پورے اقبال کو وجود میں لانے والی تصانیف کے مصنفین (اقبالیین) کے اسمائے گرامی بھی گنوائے گئے ہیں۔ مثلاً یوسف حسین خان، خلیفہ عبدالحکیم، سلیم احمد، عالم خوندمیری، ایم۔ ایم۔ شریف، عزیز احمد، مرزا محمد منور اور ''کسی حد تک ڈاکٹر سید عبداللہ''، ناقدین اقبال کو ڈاکٹر موصوف نے چار درجوں میں رکھا ہے۔ پہلا درجہ اُن ناقدین کا ہے جو مغربی

ادب سے واقفیت رکھتے ہوئے مشرقی ادب سے ناواقف تھے۔ دوسرے درجے میں وہ ناقدین اقبال شامل ہیں جو مشرقی ادب سے واقف ضرور تھے لیکن مغربی ادبیات اور فلسفے پر اُن کی نظر نہ تھی۔ تیسرے درجے میں اُن ناقدین اقبال کو شامل کیا گیا ہے جو اقبال کی مرکزی فکر و شعوریات سے بہت کم ہمدردی رکھتے تھے۔، اور جن کی فکر تعبیر و تفسیر پر حیرت اور سکتے کی کیفیت خود اقبال پر طاری ہو سکتی تھی۔ چوتھے درجے میں مستشرقین یا اُن کے ترجمہ کار ہیں۔ چنانچہ اقبال پر شائع ہوئے تمام تر سرمایے کے پیش نظر ڈاکٹر فراقی کو ہنوز اقبال کے سلسلے میں ایک جید نقاد کا انتظار ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کے (اقبال) فکر و فن کا عمق اور ان کے شعور و فرہنگ کی وسعت ایک ایسے با بصیرت ناقد کی تلاش میں ہے جو ان کے تخلیقی عمل اور ان کے نثری کارناموں، ان کی شخصیت اور نفسیات، ان کے میلانات و رجحانات، ان کی تصنیفات و ادراکات اور ان کے اُن Paradoxes کی تفہیم کلیہ کر سکے جن سے اقبال کے طالب علم دوچار ہوتے ہیں۔ اقبال کو ابھی تک ایک ایسے عمق بین ناقد کی تلاش ہے جو قطرے میں دجلہ دیکھے اور دکھا سکے۔ دِل سنگ میں بُتان آزری کا نظارہ کر سکے اور کرا سکے اور بتا سکے کہ ستارہ شکنی سے آفتاب کا ظہور کیسے ہوتا ہے اور خاک تیرہ دروں سے شیشۂ جلبی کیسے وجود میں آتا ہے''[1]

''جہات اقبال'' میں نامور اقبال شناس ڈاکٹر سید عبداللہ کی اقبالیاتی تصنیف ''مسائل اقبال'' کے علاوہ مقبول انور داودی کی تالیف ''مطالب اقبال'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فراقی اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ مذکورہ کتاب کے موضوعات میں تنوع اور تازگی کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب میں شامل بعض مضامین کے تحریر کرنے والوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ کو اولین حیثیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ اقبال شناسی کے لئے جس وسیع علمی اور تہذیبی پس منظر سے آگہی کی ضرورت ہے ڈاکٹر سید عبداللہ اُس سے بڑی حد تک بہرہ مند تھے۔ ایک منفرد ماہر تعلیم ہونے اور درس و تدریس سے اپنی گہری وابستگی کے باعث اگرچہ اُن کی تحریریں زیادہ تر تشریحی اور تدریسی نوعیت کی ہیں، تاہم ان تحریروں میں ڈاکٹر موصوف کی حکمت اور تخلیقیت کے عناصر کی کارفرمائی کا بھی اعتراف کیا گیا ہے جن سے ڈاکٹر فراقی کے الفاظ میں ''اقبال کے باب میں بعض اہم مباحث کے در وا ہوتے ہیں، اور بعض

۱۔ جہاتِ اقبال۔ جلوہ خون گشت و نگاہے بتماشا نرسید، ص ۱۶۱

ایسے پہلوؤں کا شعور حاصل ہوتا ہے جو بالعموم اقبال کے طالب علموں سے بہت حد تک اوجھل رہے ہیں''۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''مسائل اقبال'' میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھا کر اقبال اور فکر اقبال کی نسبت پھیلائے اور عام کیے گئے بعض تعصبات اور غلط فہمیوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ اِسطرح اقبال کے صحیح خدوخال نمایاں کرنے اور ان کی مرکزی فکریات کو واضح کرنے میں قابل قدر کاوش کی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے معروف ادیب مقبول انور داوڈی کی تالیف ''مطالب اقبال'' کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے ہوئے اِس کے محاسن اور معائب کی ایک غیر جانب دار نقاد کی طرح نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی نظر میں داوڈی صاحب نے اقبال کی مرکزی فکریات کی مناسبت سے تشریح طلب مقامات کی وضاحت کی ہے اور ایک لغت نویس کی مانند غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کیا ہے، تاہم ڈاکٹر فراقی کے نزدیک مولف وسعتِ مطالعہ اور اقبالیات پر عمیق نظر سے قاصر نظر آتے ہیں۔ جائزے میں موضوع کی مناسبت سے سیّد عابد علی عابد، اکبر حسین قریشی، اور نسیم امروہوی، کی تالیفات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے، ڈاکٹر فراقی نے اُن الفاظ و تلمیحات اور حوالہ جات کی تفصیل بھی درج کی ہے جن کے معانی و مفاہیم غلط درج کیے گئے ہیں۔ ''جمہوریت اقبال کی نگاہ میں'' ''جہات اقبال'' کا تیسرا مضمون ہے۔ اِس موضوع پر ڈاکٹر تحسین فراقی سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی معرکتہ الآرا تصنیف ''فکر اقبال'' اور دیگر اقبالیاتی تصانیف میں اِس موضوع پر لکھا جا چکا ہے تاہم اس مضمون کی اہمیت اِس اعتبار سے ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے جمہوریت سے متعلق علاّمہ کے اُن تمام نظریات پر بحث کی ہے جن میں اقبال نے جمہوریت کی نظریۂ حکومت کی حیثیت سے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال جمہوریت کے ہرگز خلاف نہ تھے، بلکہ اُنہیں مغربی طرز جمہوریت سے اختلاف تھا۔ اُنہوں نے جمہوریت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں پر خاصی تنقید کی ہے۔ اس کا سبب ڈاکٹر فراقی کے نزدیک یہ ہے کہ فرد کی آزادی اور اس کی شخصیت کے لاتعداد امکانات کو بروئے کار لانے میں جو بھی تصور حیات ممد و معاون ہو سکتا ہے، اقبال اُس کی سراہنا کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن ''اقبال کی نگاہ اُن سلبی پہلوؤں سے بھی نہیں چوکتی، جن میں معیار کے بجائے مقدار اور قابلیت کے بجائے مقبولیت کو طرۂ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔'' ڈاکٹر تحسین فراقی اقبال ہی کی طرح کسی خیال یا نظریہ پر عمیق غور و فکر کرتے ہوئے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ کسی مصلحت کا شکار نہ ہو کر حقیقت پسندی اور جرأت مندی سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف جمہوریت کی نسبت اقبال کے تمام نظریات یا تصورات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی وسعت فکر و نظر کا ثبوت دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"..... جمہوریت کے باب میں اقبال نے بعض معاملات اور مسائل پر بہ وجوہ روشنی نہیں ڈالی۔ مثلاً یہ کہ اسلام میں سیاسی پارٹی بندی کی گنجائش ہے اور کیا ایک حد درجہ ناخواندہ اور غیر مہذب معاشرے میں ہر شخص کو ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ نیز کیا ایک طبقاتی معاشرے میں جواز سرتا پا جاگیر دار یا سرمایہ دار کی گرفت میں ہو، جمہوریت کے ذریعے صالح، خداترس، خداجُو، انصاف پسند اور عادل قیادت بُروئے کار لائی جاسکتی ہے۔"

عصری مسائل اور فکر اقبال، اور علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ الثانیہ، جہات اقبال کے دو بڑے اہم مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فراقی عصرِ حاضر کے مسائل کو اقبال کے آفاقی پیغام پر عمل پیرا ہونے کی بدولت حل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اقبال کے حوالے سے مسلمانوں کو تقدیر پرستی سے چھٹکارا حاصل کر کے دوبارہ عملِ صالح کی طرف راغب کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جس دن مسلمان خدائی صفات کو اپنے اندر پیدا کر کے حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کا استحقاق حاصل کر لے وہی دن اُس کی نشاۃ الثانیہ کا روزِ نخستین ہوگا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک تدوین متن کا عمل نہایت ہی جانکاہ ہے۔ تحقیق جیسے سنجیدہ کام میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک تحقیق اور عُجلت میں ازلی بیر ہے۔ معاصرین اقبال کے تحریر کردہ مضامین کے حسن انتخاب پر مشتمل کتاب "نقدِ اقبال حیات اقبال میں" ڈاکٹر تحسین فراقی کی ترتیب وتدوین کردہ وہ کتاب ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر منصہ شہود پر آئی۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں مضامین ہیں اور دوسرے میں تبصرے۔ مضامین کی تعداد بیس ہے اور تبصروں کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ مضامین اپنے دور میں شائع ہونے والے خاصے مشہور و مقبول رسائل و جرائد سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اِن میں ہزار داستان، کارواں، ہمایوں، صوفی، زمانہ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ بعض مضامین ڈاکٹر موصوف نے جامعات سے شائع ہوئے مجلّات سے منتخب کیے ہیں۔ جن میں علی گڑھ میگزین اور مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن شامل ہیں۔ کتاب میں بعض اہم موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال اور ختم نبوت (سید نذیر نیازی)، لائٹ کا عجز فہم (راجہ حسن اختر) ضرب کلیم اور احمدیت (یوسف سلیم چشتی) اقبال کا فلسفۂ جہاد (ظفر احمد صدیقی) وغیرہ وغیرہ۔ اِسطرح کتاب میں شامل بعض مضامین میں

علامہ کے کلام کے شعری محاسن، بعض میں ان کے فکری، سیاسی، اور مذہبی تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ بعض اقبال کے شخصی اور سوانحی پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ بعض تقابلی مطالعات فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب وتدوین میں ڈاکٹر فراقی نے خاصی مشقت اُٹھائی ہے۔ تمام تحریروں کا امعانِ نظر سے مطالعہ کر کے ہر مضمون میں درآئی غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے، اشعار کو درست کیا ہے۔ علامہ کے اشعار کی تخریج یا استخراج کا پورا اہتمام کیا ہے، حسب ضرورت حواشی لکھے ہیں۔ جملوں کی ساخت کو درست کیا ہے۔ لِسانی فروگزاشتوں کی اصلاح کی ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔ بعض مقامات پر مصنفین کی جانب سے حاشیے لکھے ہیں۔ منتخب کیے گئے مضامین کو تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔

ترتیب وتدوین کے کام میں کمال احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو جہاں تک اقبالیات کا تعلق ہے اس حوالے سے تمام تر عملی اور فکری کاموں کی اساس یہی ترتیب وتدوین کا کام ہے۔ اقبالیات یا کسی اور موضوع کے سلسلے میں عمارت کی تعمیر میں اگر ابتداء میں کوئی کجی یا خامی رہ جائے تو پوری عمارت کے بری طرح متاثر ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔ اقبال پر مدوّن ہوئے مضامین میں احتیاط کے تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے پیدا شدہ عجیب وغریب صورتحال کا ذکر ڈاکٹر فراقی ذیل کے ان الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

> ”ہمارے یہاں تدوین وترتیب کو نہایت سہل کام سمجھ لیا گیا ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ چند رسائل وجرائد سے جو کچھ مل گیا، اُس کا فوٹو سٹیٹ کاتب یا کمپوزر کے حوالے کر دیا۔ مرتب کے طور پر اپنا نام درج کر دیا۔ چلو چھٹی۔ کتابوں کی لمبی فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو گیا۔ یہی المیہ اقبال پر مدون ہونے والے مضامین کا ہے۔ مرتب حضرات متن کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتے ہیں اور کاتب حضرات کی تحریفات سے تعرض نہیں کرتے اور یوں چھپے ہوئے ہر لفظ، حرف اور شوشے سے وفاداری بشرطِ اِستواری کا ثبوت دیتے ہیں۔ پھر حواشی کا سرے سے اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک عرصے کے بعد مرتب ہونے والی تحریروں میں حواشی کے بغیر، نامکمل، ناقص اور بعض صورتوں میں گمراہ کُن ہوتی ہیں۔ ایسی مرتّب

کے افادے کا دائرہ سکڑ جاتا ہے"۔

"مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں" ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایک قابل قدر کام ہے، یہ کام دراصل اقبال کے ایک غیر مطبوعہ مضمون بعنوان "Bedil, in the light of Bergson" کی ترتیب شرح یا تفسیر اور ترجمے پر مشتمل ہے۔ اقبال کا اپنے سوادِ خط میں تحریر کردہ فقط ایک صفحے پر مشتمل یہ مضمون ڈاکٹر تحسین فراقی کو ۱۹۸۶ء میں ایک روز اقبال میوزیم میں نوادرات اقبال دیکھنے کے دوران اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر فراقی کی خواہش کے مطابق اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی وساطت سے میوزیم کے کیوریٹر جناب مسعود الحسن کھوکھر کی بدولت اُنہیں اس مخطوطے کی فوٹو کاپی فراہم کی گئی جسے اُنہوں نے پاکستان سے شائع ہونے والے انگریزی مجلّہ سہ ماہی اقبال ریویو (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء) میں مرتب کر کے شائع کرایا، مضمون کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اقبال کی فکر کے شایقین نے فراقی صاحب سے اس کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی، چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے انتہائی کدو کاوش کے بعد اِس مضمون کا اُردو میں ترجمہ کیا جسے پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں "مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں" کے عنوان سے کتابی شکل میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ مضمون کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر آج تک اس کتاب کی تین اشاعتیں منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر فراقی نے فارسی کے ممتاز شاعر ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۶۵ء-۱۷۲۰ء) اور علامہ اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کے یہاں بعض لفظی، معنوی اور مابعد الطبعیاتی مماثلتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے دونوں کے کلام سے اشعار نقل کیے ہیں۔ دونوں اہلِ فکر و نظر کے یہاں تصوف کی جہات میں مماثلتوں اور مغائرتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں بیدل کے تصورات سے متعلق اقبال کے خیالات سے اختلاف رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر فراقی نے منطقی استدلال کے ساتھ غلط فہمیاں رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر فراقی کے ترجمے کو ملک اور بیرون ملک خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اِس مقالے کو جامعہ تہران کے ایک عالم علی بیات[1] نے فارسی کا جامہ پہنایا۔ یہ ترجمہ اقبال اکادمی پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ "مطالعۂ بیدل در پرتو اندیشہ ھای برگسون" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ نیز ڈاکٹر فراقی نے اقبال و بیدل پر ایک اور مقالہ لکھا ہے۔ جو شیراز سے ۲۰۱۰ء میں

۱۔ فارسی ترجمے کی ابتدا میں تعارفی کلمات کے تحت علی بیات نے ڈاکٹر تحسین فراقی سے زانوئے تلمذ تہہ کر کے مضمون میں موجود علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کے سلسلے میں ڈاکٹر موصوف سے رہنمائی حاصل کرنے کا خود بھی اعتراف کیا ہے تا کہ فارسی دان طبقہ بھی علامہ جیسے قد آور مفکر اسلامی کے خیالات سے بہرہ مند ہو سکے۔

اکبر بیدار وند کی مرتب کی ہوئی تین جلدوں پر مشتمل کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔ فراقی صاحب کا اوّل الزکر مقالہ بھی اِسی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر فراقی کی اقبال کے فکر و فلسفے پر ''دیدۂ بینائے قوم'' کے نام سے ایک اور تصنیف زیرِ طبع ہے۔ اِس کتاب میں جن مضامین کی اشاعت متوقع ہے۔ اُن کے عنوانات اِسطرح ہیں۔ نیا نظام عالم اور فکرِ اقبال، بانگ درا کا پہلا مکمل انگریزی ترجمہ، اسلامی ادب کی ترویج میں اقبال کا کردار، کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، اقبال، دیدۂ بینائے قوم، اقبال کا تصور تہذیب، اقبال کے شعر و فلسفہ پر رومی کے اثرات، فکرِ اقبال کی عصری معنویت، ایران میں اقبال شناسی کے دس سال، اور اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی۔ ان میں سے بعض مقالات پہلے ہی ایران کے ممتاز مجلّات میں فارسی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ جب کہ موخرالزکر مقالہ تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو اقبال پر منعقد کی گئی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں بطور کلیدی خطبہ پڑھا گیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی فکرِ اقبال کے ایک نادر نمونے کی روشنی میں

اقبال کی فکر اپنی عمق اور وسعت کے اعتبار سے عالمگیر سطح پر نوعِ انسانی کو بلاتفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کے نہ صرف متاثر کرتی رہی ہے بلکہ غیر معمولی طور پر مستفید ہونے کی قوت سے بھی بہرہ مند کرتی رہی ہے۔ اقبال کا فکر مذہبی فلسفہ ہے۔ اُنہوں نے خدا، حیات، کائنات اور انسان کی ماہیت اور حقیقت پر غور و فکر کرتے ہوئے انسان کو بھی قرآن کی روشنی میں تفکر اور تدبر کر کے اپنی غایت تخلیق کی تکمیل کے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔ اقبال اُن تمام تخلیقی ذہنوں سے برآمد ہونے والے افکار و خیالات کا تجزیہ کر چکے ہیں، جنہوں نے خدا، کائنات اور انسان سے متعلق افکار اور مسائل پر گہرے فکر سے کام لیا ہے۔ ان میں مشرق اور مغرب دونوں کے اہل فکر شامل ہیں۔ ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ، جو فارسی شاعری کے ممتاز شعراء میں اپنا ایک اہم مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، کے افکار کا بھی اقبال تجزیہ کر چکے ہیں، اس عظیم المرتبت فارسی شاعر کے افکار سے اتفاق بھی کیا ہے، انہیں سراہا بھی ہے، لیکن ساتھ ہی ان کے پیش کردہ بعض تصورات سے اختلافِ رائے بھی ظاہر کیا ہے۔ اپنی بیاض "Stray Reflections" (جس کا ترجمہ افتخار احمد صدیقی نے ''شذرات فکرِ اقبال'' کے نام سے کیا ہے) میں جہاں علامہ نے ہیگل، گوئٹے، غالب اور ورڈس ورتھ کے افکار سے اکتساب فیض کا اعتراف کیا ہے، وہاں مرزا بیدلؔ اور غالبؔ نے اُنہیں یہ تعلیم دی ہے کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی رُوح کس طرح زندہ رکھی جا سکتی ہے۔ اقبال بیدلؔ کے کلام سے اپنی غیر معمولی دلچسپی اور محبت کا ثبوت بیدلؔ کے اشعار کی تضمین کی صورت میں پیش کر چکے ہیں۔ بیدل اور اقبال کے فکر کے بعض پہلو جہاں مماثلت رکھتے ہیں، وہاں وہ ایک دوسرے سے مخالف بھی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں ''۔۔۔ دونوں کا حق اور حقیقت کے بارے میں نقطۂ نظر بہت مماثل ہے۔۔۔ اقبال۔۔۔ بحیثیت مجموعی۔۔۔ بیدل کی نفس انسانی میں گہری بصیرت کے بے حد مداح نظر آتے ہیں۔ پھر دونوں عظیم شعراء وجدان ہی کو وہ معیار اور وسیلہ قرار دیتے ہیں جس کی مدد سے کائنات کی

تفہیم ممکن ہے۔ دونوں کا موقف یہ ہے کہ مجرد اور نری کھری عقل پرستی سے کام نہیں چلتا۔ دونوں عظمت انسان کے قائل ہیں اور دونوں کی نظر وجود انسانی میں موجود ان بے پناہ امکانات پر ہے جن کے بل پر فطرت کی قوتوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے اور اعلیٰ ترین مراتب پر فائز ہوا جا سکتا ہے۔" (ص ۹) "Bedil in the Light of Bergson" اقبال کا اپنے سوادِ خط میں تحریر کردہ وہ غیر مطبوعہ نہایت اہم مضمون ہے جسے پاکستان کے نامور ناقد، دانشور، محقق، ترجمہ کار اور اقبال شناس ڈاکٹر تحسین فراقی کو ۱۹۸۶ء میں ایک روز اقبال میوزیم میں موجود نوادرات اقبال دیکھنے کے دوران اتفاق ہوا۔ انگریزی زبان میں لکھا گیا یہ مضمون فقط ایک صفحے پر مشتمل تھا۔ باقی صفحات کے بارے میں واللہ اعلم بالصواب ہی کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کی فکر بلیغ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر فراقی کی خواہش پر اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی اجازت سے میوزیم کے کیوریٹر جناب مسعود الحسن کھوکھر کی بدولت ڈاکٹر موصوف کو مخطوطے کی فوٹو کاپی فراہم کی گئی جسے ڈاکٹر موصوف نے اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہونے والے انگریزی مجلّہ سہ ماہی اقبال ریویو (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء) میں مرتب کر کے شائع کرایا۔ مضمون کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر فکر اقبال کے شائقین نے ڈاکٹر فراقی سے اس کا ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے انتہائی کدوکاوش کے بعد اس مضمون کا اُردو میں ترجمہ کر کے اسے پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں "مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں" کے زیر عنوان شائع کرایا۔ آج تک اس کتاب کی تین اشاعتیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، اشاعت اول ۱۹۸۸ء، اشاعت دوم ۱۹۹۵ء، اور اشاعت سوم ۲۰۰۳ء میں عمل میں آ چکی ہے۔ موخرالذکر اشاعت کے ناشر اقبال اکادمی پاکستان کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد سہیل عمر ہیں۔ اقبال کا یہ تحریر کردہ غیر مطبوعہ مضمون اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بعض حصوں سے ڈاکٹر فراقی نے اقبال کی بعد کی تحریروں کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے فکر کے بتدریج ارتقاء کا حال معلوم کیا ہے۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر فراقی نہ صرف فکر اقبال کے دقیق موضوعات سے اپنی دلچسپی اور عشق کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ ان کی تفہیم کیلئے کتنے ہی ہفت خواں طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنی دقت طلبی اور جدت طرازی کی بدولت اقبال کے بحر ذخار کی غواصی کرتے ہوئے نہایت بیش قیمت گوہر آبدار برآمد کرتے ہیں۔ اقبال کے اس مضمون پر غالبؔ کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

تخلیق کے عمل میں اقبال کا رہوارِ قلم اس قدر گریز پا نظر آتا ہے کہ اپنے خیالات کے محشرستان کو صفحۂ قرطاس پر اُتارتے وقت تیز بہاو نے اتنی مہلت ہی نہ دی ہے کہ انہیں کوئی آسانی سے پڑھ سکے۔

چنانچہ ہر جملے، ہر لفظ اور ہر پیراگراف کو پڑھنا قاری کے لئے کسی آزمائش سے کم نہیں۔ لیکن ڈاکٹر فراقی اس مبارزتی عمل سے احمد جاوید اور ڈاکٹر محمد سہیل عمر کی معاونت کی بدولت کامیاب و کامران ہو کر گزرے ہیں۔ غیر معمولی اہمیت کے حامل اقبال کے اس مضمون کو مزید قدر و منزلت بخشنے میں ڈاکٹر موصوف کی جملہ صلاحیتیں اور استعداد بروئے کار آچکی ہے، مرتب کی، محقق کی، نقاد کی، اور ترجمہ کار کی، نیز اُن کی مشرقی اور مغربی فکر و فلسفے اور ادب پر گہری نظر کی۔ بالخصوص بیدل، اقبال اور برگسان تینوں اہل فکر و نظر کی شاعری اور فکریات کی۔ کتاب میں درج کیے گئے حواشی سے ڈاکٹر فراقی کے وسیع اور بسیط مطالعے اور بصیرت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے ''مفصل اور سیر حاصل'' تعارف کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ فراقی صاحب نے اقبال کی ابتداء سے لیکر کے آخر تک تصنیف کی گئی تمام تر منظوم اور منثور تصانیف کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کیا ہے جو اُن کے شعری مجموعوں (اُردو و فارسی) خطبات، بیاض، مکاتیب، بیانات، تقاریر اور دیگر تحریروں پر مشتمل ہیں۔ فراقی صاحب نے فارسی کے بلند مرتبت، مفکر شاعر ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۶۴ء۔۱۷۲۰ء) اور علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے یہاں بعض لفظی، معنوی اور مابعد الطبعیاتی مماثلات کی نشاندہی کرتے ہوئے دونوں کے کلام سے اشعار نقل کیے ہیں۔ فراقی صاحب بیدل اور اقبال کے یہاں تصوف کی جہات میں نہ صرف بعض مماثلتوں کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ بیدل کے صوفی شاعر کی حیثیت سے اقبال کے اختلافات کا بھی ذکر کرتے ہیں، یہ بیدل کے تصوف کی وہ جہت ہے جسے تنزل (descent) یا بہ الفاظ دیگر Retrograde Journey سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اور جس کی ہمہ اوستی صوفیاء نے بڑے شدومد سے تبلیغ کی ہے اور جسے علامہ اقبال نے رہ رہ کر روحِ اسلامی کے منافی قرار دیا ہے۔ اقبال بیدل کو اپنے مضمون میں حیات بعد الممات کا منکر قرار دے چکے ہیں، لیکن فراقی صاحب اقبال کے اس خیال سے متفق نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اقبال کے اس خیال کو صحیح ماننے سے نہ صرف مذہب کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں بلکہ بعث بعد الموت کے دیگر متعلقات بھی معرض شک میں پڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فراقی کے نزدیک بیدل کے متعلق عام کی گئی اس غلط فہمی کو، کہ وہ حیات بعد الممات کے قائل نہ تھے، ژری بیکا کے تحریر کردہ مضمون ''تاجیک ادب سولہویں صدی سے زمانہ حال تک'' سے ماخوذ ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ شاید اسی کی پیروی میں بیدل کو نہ صرف بعث بعد الموت کا منکر قرار دیا جاتا ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ جنت و دوزخ کو فرضی کہانیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ فراقی صاحب نے ژری بیکا کے مضمون سے ایک ایسا بیان بھی نقل کیا ہے جو انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''بیدل اسلام کے فراہم کردہ جوابات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ اُنہوں نے ہندومت
اور اسلام کے بعض عناصر کے تال میل سے اپنا تصورِ کائنات اور تصورِ انسان مرتب کیا۔''

اس طرح کی گمراہیاں اقبال کے سلسلے میں بھی عام کردی جا چکی ہیں، میں یہاں فقط ایک مثال دینے پر اکتفا کروں گی۔ اقبال کے متعلق ای۔ جی۔ براؤن نے "The Literary History of Persia" میں اقبال کے فکر کو "Oriental Adaptation of Nietzsche's Ideas" قرار دیا ہے اور اسی کی تقلید میں بعد میں اقبال کے متعلق غلط فہمی عام ہوئی کہ اقبال کا فلسفۂ خودی جرمن مفکر فیڈرک نطشے سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ دونوں کے افکار میں خودی کے حوالے سے بعض سطحی مشابہتیں یقیناً ہیں لیکن دونوں کے راستے تھوڑی دیر ساتھ چلنے کے بعد الگ الگ ہو جاتے ہیں اور دونوں کی منزل مقصود جداگانہ ہے۔ ڈاکٹر فراقی نے بیدل کی نسبت اقبال اور ژری بیکا دونوں کے خیالات پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیدل دراصل کائنات کو واقعۂ واحدہ مانتے تھے۔ وہ ماضی اور مستقبل دونوں کو محض تغیرات مانتے تھے اور اُن کے نزدیک کائنات حال ہی میں موجود ہے۔ ڈاکٹر فراقی نے کلامِ بیدل[1] سے وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن کی رو سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بیدل فرد کی موت کے بعد اُس کی حیاتِ ثانی کے قائل تو ہیں لیکن اس ظہور کو پہلے کے بالکل مماثل نہیں مانتے۔ بیدل کے اشعار کو درج کرتے ہوئے وہ ان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ حیات بعد الموت کے منکر نہ تھے، البتہ انہوں نے اس ضمن میں عمومی تصور کی پیروی نہ کرتے ہوئے ایک الگ راستہ اپنایا ہے جو گذشتہ تصورات سے مختلف ہے۔ حیات بعد الموت کی نازک اور پیچیدہ بحث کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر فرد کی موت کے بعد نقش دگر وجود میں آئے گا تو سزا و جزا کس پر وارد ہوگی۔ اس ضمن میں فراقی صاحب نقش و قالب کی تبدیلی کو روح کی تبدیلی کیلئے لازم نہیں سمجھتے، اس لئے فرد کی موت کے بعد جو بھی نقش یا پیکر وجود میں آئے گا، سزا اور جزا اُسی پر وارد ہوگی کیونکہ اس پیکر میں جو روح موجود ہوگی وہ روح روحِ سابقہ ہی ہوگی۔ ڈاکٹر فراقی نے حیات بعد الممات کی اس پیچیدہ اور نازک بحث پر طوالت سے گریز کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خود اقبال کا تصورِ حیات بعد الممات (خطبات کی روشنی میں) مرزا بیدل کے تصورِ بعث بعد الموت سے متاثر نظر آتا ہے بلکہ میرے خیال میں اقبال کے تصورِ حیات بعد الممات پر بیدل کے تصورِ حیات بعد الممات کے علاوہ قرآن اور مشرق

۱۔ صورتِ ایں انجمن گر محو شد پروا کراست خامۂ نقاشِ ما نقشِ دگر خواہد نمود
پیکرِ ہستی مارا برہ سیلِ فنا یادِ بربادی ازاں نیست کہ معمارے ہست

کے برگزیدہ حکماء کے اثرات کے علاوہ اُن کی ذاتی تخلیقی فکر کی کارفرمائی بھی ہے۔

مرزا بیدل کی جائے پیدائش کا جہاں تک تعلق ہے، بیدل پر لکھنے والوں نے مختلف مقامات جیسے بخارا، اکبر آباد، دہلی، اور لاہور وغیرہ کو ان کا مولد قرار دیا ہے، علامہ اقبال نے بھی اپنے مضمون "Bedil in the light of Bergson" کے ابتدائی جملے میں ہی اُن کا مقام پیدائش اکبر آباد تحریر کیا ہے۔ اپنے خطبات میں بھی انہوں نے اس ممتاز فارسی شاعر کو بیدل اکبر آبادی کے الفاظ سے ہی یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر فراقی نے تحقیق وتدقیق سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی کی بیدل پر تحریر کردہ کتاب "Life and Works of Abdul Qadir Bedil" کے تناظر میں مرزا بیدل ہی کے ایک ہمعصر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اور اسے مستند مانتے ہوئے عظیم آباد پٹنہ ہی کو ان کا مولد ہونے کا شرف بخشا ہے۔

فرانسیسی مفکر ہنری برگسان (۱۸۵۹ء۔۱۹۴۱ء) کی دو مشہور و مقبول تصانیف "Elan Vital" (جوششِ حیات) اور "Intution" (وجدان) کی انیسویں صدی کے اختتام پر جو توضیحات پیش کی گئیں، انہیں بیسویں صدی کے ربع اول میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ علامہ اقبال بھی ہنری برگسان کے افکار کا مطالعہ کر کے ان سے جزوی طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ دونوں کا فکر بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مماثلت رکھتا ہے۔ اقبال برگسان کے pure duration یا مرورِ محض سے خاصے متاثر ہوئے، چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں اس کی وضاحت اور وکالت کی ہے۔ اس کا ثبوت اُن کی پہلی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے عنوان ''الوقت سیف'' (وقت تلوار ہے) کے تحت امام شافعی کے مشہور قول ''وقت شمشیر قاطع ہے'' کے نقل کرنے سے فراہم ہوتا ہے۔ اور پھر مرورِ محض یا pure duration کی مزید توضیح کیلئے زمانِ حقیقی کے حق میں لی مع اللہ وقت اور لاتسبوا الدھر[1] کی احادیث بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔ اسیرانِ دوش وفردا کو مخاطب کرتے ہوئے وہ انہیں حقیقی کائنات کی جانب راغب کرتے ہیں۔ یہ حقیقی کائنات وہ کائنات ہے جو ان کے دل میں موجود ہے۔ درحقیقت ان کوتاہ بین لوگوں نے وقت کو ایک خطِ مستقیم سمجھ کر لیل ونہار کو اس خط پر لگے ہوئے نقطے قرار دے رکھا ہے جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ زماں نامختتم اور غیر منقسم اکائی ہے۔ اقبال نے اس اہم نکتے کو اسرارِ خودی کے عنوان ''الوقت سیف'' کے تحت آنے والے اشعار کی مدد سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فراقی انہیں نقل کرتے ہوئے

۱۔ اقبال نے جب یہ حدیث برگساں کو سنائی تھی تو وہ کرسی سے اُچھل پڑا تھا۔

لکھتے ہیں کہ اقبال نے مرورِ محض کی روشنی میں اپنے تصورِ زماں کی جو وضاحت کی ہے، وہ برگسان کے فلسفے کا اہم ستون ہے، تاہم اقبال نے برگسان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مذکورہ انگریزی مضمون میں ہنری برگسان اور مرزا بیدل کی فکریات میں کئی مماثلتوں کو تلاش کیا گیا ہے۔ فراقی صاحب نے ان مماثلتوں کو بیدل اور برگسان جیسے دو اہل فکر و نظر تک ہی محدود نہیں بتایا ہے بلکہ ان کے نزدیک خود اقبال کی منظوم اور منثور تحریروں میں اس نوع کے شواہد موجود ہیں۔ فراقی صاحب نے بیدل، اقبال اور برگسان تینوں اہل فکر و نظر کو فلسفۂ تغیر و حرکت کا قائل قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس تصور کو ایک اعتبار سے ہراقلیتس کے اس فلسفے کا منبع قرار دیا ہے جس کی رُو سے حقیقت ہر لمحہ متغیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے برگسان کے Creative Evolution یعنی تخلیقی ارتقاء کو ہر یقلس کے فلسفے سے بے حد مماثل قرار دیا ہے۔ فراقی صاحب کی نگاہ اس اہم نکتہ پر بھی رہی ہے کہ اقبال نے جہاں بیدل اور برگسان کے افکار کو جزوی طور پر سراہا ہے وہاں ان کے فکر کے بعض پہلوؤں سے اختلافِ رائے بھی ظاہر کرتے ہوئے ان پر شدید تعریضات وارد کی ہیں۔ مثال کے طور پر برگسان نے pure duration یا زمان خالص کو خودی پر متقدم ٹھہرایا ہے لیکن اقبال کے نزدیک زمان خالص اسنادِ خودی یا نفس ہی کی بدولت ہو سکتا ہے۔ زمانِ محض میں یہ صلاحیت نہیں کہ اشیاء یا حوادث کی کثرت کو سہارا دے سکے۔ اسی طرح عجمی تصوف (جس میں صوفیاء نے ہمہ اوست کی تبلیغ و ترویج کی ہے) کے تحت صوفیاء کے پیش کئے گئے تصورِ فنا پر اقبال وقتاً فوقتاً اپنی نثری تحریروں اور شاعری کے ذریعے شدید تنقید کرتے ہوئے اصل اسلامی تصور پر، جس کی اساس قرآن و حدیث پر ہے، زور دیتے رہے ہیں۔ صوفیاء کے تصورِ تنزل (Descent) پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے اسے اپنی روح کے اعتبار سے مانوی (Manichean) قرار دیا ہے، اقبال مانویت کو عیسائیت اور اسلام دونوں سے متاثر قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فراقی اقبال کے مضمون سے ذیل کا یہ اقتباس بطور حوالہ دیتے ہیں:

> ''عربوں کی فتح ایران کے نتیجے میں اسلام مانویت میں مبدل ہو گیا اور خدا کی خود ظلماتی کا تصور صوفیا کے تصورِ تنزل کی شکل میں، جس کے ساتھ ایسی رابیت آمیز تھی جو اپنی روح کے اعتبار سے کلیتہً مانوی تھی، ظاہر ہوا۔''

ڈاکٹر فراقی اسلام کے مانویت سے متاثر ہونے سے اتفاق کرتے ہیں اور اے۔ ایم۔ شوستری کی کتاب "Outlines of Islamic Culture" کے پیشِ نظر وہ عیسائیت اور اسلام دونوں کے مانویت سے متاثر ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن اقبال کے اس بیان کو، کہ اسلام مانویت میں تبدیل ہو گیا ہے، قابل

بحث قرار دیتے ہیں کیونکہ اپنے مختلف تصورات، جیسے تصورِ توحید، تصورِ رسالت، تصور انسان اور تصورِ کائنات کے اعتبار سے اسلام کی عظمت وانفرادیت اس قدر واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ مانویت اس پر کاملاً غالب آکر اس کی قلب ماہیت کا باعث بن گئی ہو۔ اقبال اصل میں اپنے فکری بلوغ کے زمانے سے لیکر کے آخری برسوں تک اسلام پر غیر اسلامی عناصر کی جمی ہوئی دبیز پپڑی کو اتار کر اسلام کو اس کی اصل یا حقیقی شکل میں پیش کرنے اور اس پر مسلمانوں کے سختی سے عمل پیرا ہونے پر خاصا زور دیتے رہے ہیں۔

ان کی اپنی بیاض "Stray Reflections" (مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال ۱۹۱۰ء) میں ایک جگہ تہذیب اسلامی کی تہہ داری کا سبب ایران کی قدیم تہذیب سے اس کے اتصال کو قرار دیتے ہیں جس پر نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال فتحِ ایران کے بغیر اسلامی تہذیب کو یک رخی تہذیب کہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک فتح ایران نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ بالکل ویسا ہی ہے جو فتحِ یونان سے رومیوں کو حاصل ہوا تھا۔ "Stray Reflections" میں درج اقبال کے بیان اور اقبال کے تحریر کردہ زیر بحث انگریزی مضمون دونوں کا غائر مطالعہ کرنے پر اقبال کے فکر کے تدریجی ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے اور اسی سے ڈاکٹر فراقی کو اقبال کے اس انگریزی مضمون کے تحریر کئے جانے کا بھی تعین کرنے میں نہ صرف مدد ملی ہے بلکہ ان کے اس خیال کو تقویت ملی ہے کہ یہ مضمون ۱۹۱۶ء یا اس کے آس پاس لکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ مضمون میں عجمی تصوف کے باب میں اقبال کے لہجے میں جو تلخی اور شدت ملتی ہے وہی شدت ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی اور ۱۹۱۷ء میں سید سلیمان ندوی کو تحریر کئے گئے ایک خط میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر فراقی نے بجا طور پر اقبال کے قیام یورپ کو حیاتِ اقبال کے ایک اہم موڑ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ۱۹۱۰ء کے بعد اقبال مسلسل اور متواتر مسلم نشاۃ الثانیہ اور تصورِ خودی پر غور وفکر کرتے رہے ہیں۔ بقول اقبال ہی کے مسلسل پندرہ برس تصور خودی پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امتِ مسلمہ کے زوال کا ایک اہم سبب عجمی تصوف ہے جس نے اسلامی فکر وعمل میں داخل ہو کر اس کی قوتوں کو ہڑپ کر لیا۔ اور یہ خیال بقول ڈاکٹر فراقی خوب منجھ اور نتھر سنور کر باقاعدہ شکل اختیار کر کے نہ صرف ''اسرار خودی'' کی شکل اختیار کر گیا بلکہ اقبال کی بعد کی منظوم تصانیف اور نثری تحریروں میں، جن میں خطبات بھی شامل ہیں، شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ زیر نظر مضمون کے اس حصے سے، جس میں عجمی تصوف کی بوالعجبیوں پر تنقید کی گئی ہے، کو ڈاکٹر فراقی نے اسرار خودی میں اسی قسم کے تصوف کی مخالفت کا تتمہ قرار دیا ہے۔

مثنوی اسرار خودی میں اقبال کی طرف سے عجمی تصوف اور اس کے نمائندوں پر شدید تنقید نے تصوف کے ہمہ اوستی حلقوں میں شدید برہمی پیدا کر دی۔ ڈاکٹر فراقی کے نزدیک اگر یہ مضمون ۱۹۱۵ء کے

آس پاس لکھا گیا ہوگا تو ممکن ہے کہ اقبال نے مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعتِ اول پر ہوئے ردِّعمل کے پیش نظر اسے شائع نہ کرنے ہی میں مصلحت سمجھی ہو اور یہی سبب اس مضمون پر اقبال کی نظرِ ثانی نہ کرنے کا بھی رہا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر فراقی نے مضمون کے الفاظ میں ہجوں کی درستی کی ہے۔ محو ہوئے اور غائب الفاظ کی جگہ مناسب الفاظ درج کیے ہیں۔ مضمون کا ترجمہ کرتے وقت ضروری اضافات کو پیش نظر رکھا ہے، جو فکرِ اقبال اور اس کے مختلف پہلوؤں کے عین مطابق ہیں۔ بعض مقامات پر حسبِ ضرورت حواشی کے علاوہ مضمون کے اختتام پر بھی نہایت مفید حاشیے درج کیے ہیں۔

اقبال کا انگریزی میں تحریر کردہ مضمون "Bedil, in the Light of Bergson" ڈاکٹر تحسین فراقی کی دریافت، ترتیب اور ترجمہ وغیرہ کے پیش نظر ''مطالعۂ بیدل فکرِ برگسان کی روشنی میں'' کی صورت میں وہ مختصر اور جامعہ قابل قدر تصنیف ہے جسے ملک اور بیرونِ ملک خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایران کے ایک عالم علی بیات نامی (تہران یونیورسٹی) نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ اقبال اکادمی لاہور پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا عنوان ہے ''مطالعۂ بیدل در پرتو اندیشہ ھای برگسون''۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''اقبال اور بیدل'' پر ایک اور مقالہ تحریر کیا ہے، جو شیراز سے ۲۰۱۰ء میں اکبر بہ اروند کی تین جلدوں پر مشتمل ترتیب دی ہوئی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔

تم نے مجھے خرید کر انمول کر دیا

فکرِ اقبال کا اجمالی جائزہ

اقبال کا شمار اُن مسلم حکماء میں ہوتا ہے جو مغرب میں اپنے مخصوص اور نمایاں طرزِ فکر کی بدولت کافی دور دور تک اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں اور جن کا یورپ نے علم و فضل اور فلسفہ کے میدان میں قرار واقعی اعتراف کیا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کے نزدیک اقبال شاعری اور فلسفہ میں ایک عظیم مقام رکھتے ہوئے ایک ماہر تعلیم، انسان دوست اور مسلمان کی حیثیت سے بھی عظمت کے حامل ہیں۔ اُردو اور فارسی میں انجام دیئے گئے کارناموں اور انگریزی خطبات (بعنوان تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) میں اُنہوں نے مذہب کو فلسفہ کے ساتھ آمیخت کرنے کی سعی کی ہے اور ابدی اقدار کی ترجمانی کرتے ہوئے جدید دنیا کو درپیش عصری مسائل اور امور سے بحث کرنے کی مربوط اور منظم کاوش کی ہے۔

بے یقینی اور بے اعتباری کے اس دور میں اقبال نے دنیا کو امید اور ایمان کا پیغام دیا ہے اور حیاتِ انسانی کے مفہوم اور معنویت اور اس کی پراسراریت (جس کے ارتقاء کے ڈرامائی عمل میں اُس کے تخلیقی کردار نے اقبال کے تخیل کو گہرے طور پر متاثر کر کے اپنی اور مائل کیا) سے پردہ سرکایا۔

اہم اور مقدم مسائل: اقبال کے سامنے کون کون سے بڑے اور اہم مسائل رہے ہیں۔ یہ مخصوص مسائل کچھ اس طرح ہیں: وجود باری کا اقرار، نفس کی حقیقت، اس کی حریت اور غیر فانیت، اور سب سے آخر میں حریت، مساوات اور یک جہتی پر مبنی ایک فعال معاشرتی نظام کی تخلیق۔ اقبال رومی کے علاوہ برگسان کے قوت نمو (Vitalism) سے متاثر ہوئے۔ نطشے نے بھی انہیں گہرے طور پر متاثر کیا۔ کیمبرج میں فلسفے کی طالب علمی کے زمانے میں اُنہوں نے میک ٹیگرٹ سے بھی خاصا استفادہ کیا۔ تاہم یہ واضح رہے کہ ان تمام اثرات کے باوجود اقبال نے دنیا کو جو پیغام دیا وہ اُن کے ذاتی اور مخصوص عمیق غور و فکر اور انعکاس کا نتیجہ تھا کیونکہ یہ اُن کی اپنی روحانی اقدار اور تصورات تھے جنہوں نے انہیں ایک نیا نظام اور ایک نیا فلسفہ عطا کیا۔

نظریۂ خودی: فلسفۂ اقبال کا سنگِ بنیاد اُن کا نظریۂ خودی یا انا یا نفس کا ارتقاء ہے۔ دوسرا اہم نکتہ ایک روحانی اساس پر مبنی اُن کا نظامِ کائنات ہے۔ چنانچہ اقبال نے نسبی رشتوں کی اہمیت پر زور دینے والے تمام خیالات کا ابطال کیا ہے۔ جغرافیائی عنصر بحیثیت وحدتِ انسانی اقبال کے تخیل و ذہن کو کبھی متاثر نہیں کر پائے۔

عقل و وجدان: اقبال نے جدید سائنس کی کٹھ ملائیت یا رجعت پسندی (Dogmatism) جو حسی ادراک سے آگے کسی بھی حقیقت کے امکان میں یقین نہیں رکھتی، کی خاص طور سے تنقیص کی ہے۔ اقبال نے یہ بات منکشف کی کہ حواس اپنی موروثی مغائرت کی بدولت ناقص ہیں۔ جہاں تک حیات کے ارفع رُخ یا پہلو کی دریافت کا تعلق ہے، وہ رُخ، یا پہلو جس کے وجود کا فلسفہ میں افلاطون کے زمانے سے لیکر کے برگسان اور بعد ازاں اعتراف کیا جا چکا ہے، زندگی کے اس ماورائی رُخ کا ادراک ایک دوسرے زیادہ براہ راست ادراک، جسے وجدان کہا جاتا ہے، جو حقیقت کے عرفان و ادراک کا ایک یقینی اور مؤثر وسیلہ ہے، کی بدولت کیا جا سکتا ہے۔ یہ وجدان کوئی معمولی دانشورانہ ہمدردی نہیں، جیسا کہ برگسان کی سوچ سے محسوس ہوتا ہے، لیکن اقبال کے نزدیک یہ ایک عمیق اور شفاف منبع علم، علم کا محور اور منبع نور ہے۔

اقبال کے نزدیک وہ علم، جو نتیجہ نکل سکنے کے قابل، یا اطلاقی یا نسبتی ہو، انتہائی ناکافی ہے اور ایسا علم ذات مطلق اور غیر متناہی کی ایک جھلک پانے اور ذہن انسانی کی باطنی تسکین و اطمینان بخشنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ اس تشنگی یا بھوک کو اگر کوئی چیز تسکین و اطمینان فراہم کر سکتی ہے تو وہ صرف وجدان یا وجدانی قیاس یا ادراک ہے، تاہم یہ وجدانی قیاس یا ادراک ذہن و شعور کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ قلب کی صفت ہے۔

وجدانِ نفس: اقبال کی نظر میں وجدانِ نفس دو طرح کا ہے۔ (۱) ذات باری کا وجدان (۲) نفس کا وجدان۔ اقبال مادی دنیا کی حقیقت پر ایقان رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی فعالیت، تحرک اور جہد و کاوش کا نام ہے۔ یہ نفس انسانی کی بیداری کا نتیجہ ہے جو جہد و کاوش اور تحرک کی بدولت نشو و نما حاصل کر کے زندہ رہتی ہے۔ انا یا عرفانِ نفس یا شعور ذات کے عمل کے ذریعے استحکام عطا کیا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں متحرک اور فعال شخصیت کے افراد پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کی نگاہ میں زندگی زندہ رہنے کا ارادہ کرنے کا نام نہیں بلکہ زندگی بطریق احسن (قانونِ ایزدی کے تابع ہو کر) گزارنے کا نام ہے۔ حیاتِ

انسانی کا مقصد واحد قوت، جیسا کہ نطشے کا خیال ہے، نہیں لیکن عشق اور زندگی بطریق احسن کرنا ہے۔ اس حیات کے دو بنیادی اور اہم عوامل یا اجزاء ہیں۔ خودی اقبال کے نزدیک وہ تخلیقی قوت ہے جو انسان کو نہ صرف زندگی بطریق احسن گذارنے بلکہ زندگی کے اعلیٰ وارفع مقامات اور حقیقت کا سراغ پا جانے، اُس کا انکشاف کرنے اور انہیں مسخر کرنے کے اہل بناتی ہے یہاں تک کہ خودی، حقیقت ابدی یعنی خدا کا ادراک، جو اُس کی منزلِ مقصود ہے، حاصل کرے۔

اقبال کے نزدیک انسان (انائے غیر مطلق) خدا تک (انائے لامتناہی) عشق، عبادت اور عمل کی بدولت رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اس تمام جہد و عمل میں مصروف یا سرگرم انسانیت کو ایک ایسی زندگی کے حصول کی جانب ہدایت کی گئی ہے جو دُکھ درد اور کلفت غم سے آزاد ہو، جس کے نتیجے میں بندہ اپنے محبوبِ حقیقی یعنی خدا کے ساتھ مل کر سرور سے معمور شعور سے فیض یاب ہو۔ بندہ کی یہی جہد و کاوش ایک تخلیقی قوت کی حیثیت سے شخصیت کے ارتقاء میں ایک قوی عنصر ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک اطمینان بخش اور آسودہ زندگی کی جانب بندہ کی رہنمائی کرتی ہے جسے نرے تفکر یا مراقبے کے باعث ہرگز حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی خاطر اقبال اس جہان میں، جس کا ایک باقاعدہ مقصد و مدعا ہے، انسان سے اپنے نفس پر اعتماد اور خدا پر ایمان و ایقان کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ انسان کو ایک فرض کی انجام دہی اور ایک مقصد کی تکمیل، جو اپنی نوعیت کا ایک نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ مقصد ہے، کے لئے خلق کیا گیا ہے۔

مغرب کی دانشوری: مغرب کی سائنسی ترقی کی ستائش کے باوجود، اقبال مغرب کی سطحی دانشوری (over intellectualism) کے مداح نہیں، جس نے اقبال کے نزدیک بنیادی انسانی ہمدردیوں کی روشنی سے محروم ہو کر نزاعات اور جنگ و جدل کو ہوا دی ہے۔ مغرب کی اس سطحی دانشوری نے باطنی حسن اور روحِ انسانی کی گہرائیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان عوامل کے ذریعے وہ نظام وقوع پذیر ہوئے ہیں جو انتہائی غیر انسانی اور بربریت سے عبارت ہیں۔ چنانچہ اقبال نے زندگی اور حقیقت کے تئیں مغرب کے سطحی دانشورانہ رویے کو مسترد کیا ہے اور یورپ کے اس سطحی دانشورانہ رویے کے تناظر میں زندگی کے تئیں مادّی نظریے کی مخالفت میں بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ زندگی کی نسبت مغرب کے اس دانشورانہ نقطۂ نظر کے خلاف اقبال کا خاص اعتراض یہ ہے کہ یہ باہمی بے اعتباری، اور غیریت یا اجنبیت کی تعلیم دیکر انسانی رشتوں کے بندھن کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے وجود انسانی کی اہم حقیقت سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں وہ نفسیاتی حالات پیدا کئے جاتے ہیں جو لابدی انسانی مسرت اور باطنی

تسکین واطمینان کیلئے مضرت رساں ہیں۔ اقبال کے خیال میں نسل انسانی کی وحدت یا اتحاد کیلئے آزاد، خوشحال اور بلاشبہ ایک ٹھوس تر معاشی نظام کا قیام صرف خدا پر ایمان لانے کی صورت میں عمل میں لایا جاسکتا ہے جہاں خونی رشتے اور علاقائی نسبتیں بے معنی ہوکر ناکام ہوچکی ہیں۔ وہاں اس طرح کی روحانی یا ضرورت سے زیادہ مادی سوچ نسل انسانی کو متحد کرنے کے لئے روشن فضا رکھتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ازم لاحاصل ثابت ہوئے لیکن بے اعتباری، یاسیت، اور باہمی افتراق کے ذریعے انسانیت کی چیر پھاڑ ضرور ہوئی۔ یہ فقط توحید ہے جو نوعِ انسانی کو دوبارہ متحد کرسکتا ہے، یہ شعور پیدا کرکے کہ تمام بندگانِ خدا خدائے واحد کا عیال ہے۔

بین الاقوامیت یا عالمگیریت: بعض ناقدین نے اقبال کو مخالف قوم پرست سیاست دان قرار دیا ہے۔ یہ خیال صاف طور پر اقبال کے خیالات کی غلط تفہیم اور تعبیر پر مبنی ہے جسے رفع کرنے کیلئے اُن زبانوں کا غائر مطالعہ اور علم ضروری ہے جن میں اقبال کے کارنامے موجود ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ اقبال محدود قسم کی (parochial) قوم پرستی میں یقین نہیں رکھتے لیکن اُنہیں محبِ وطن نہ سمجھنا یا یہ کہنا کہ انہیں اپنے ملک سے محبت نہ تھی، صحیح نہیں ہوگا۔ اُن کی اہم تصانیف جاوید نامہ، کشمیر پر نظمیں، مثنوی پس چہ باید کرد میں ہندوستان اور مشرق کے اہالیان کے حقوق کی حمایت اور تائید یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ اپنے مادرِ وطن سے اُنہیں گہری محبت تھی اور وہ اپنے وطن کے ایک پرجوش مدّاح تھے۔ تاہم وہ بین الاقوامی طرز یعنی خدا کی وسیع وعریض زمین کو محدود خطوں میں مقید نہ کرنے والے (pan-human) معاشرتی نظام میں یقین رکھتے تھے جس میں نوعِ انسانی کو منقسم کرنے کی بجائے اُنہیں باہم متحد کیا جاتا ہے۔

اقبال ایک سیاست دان نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ملک کی سیاست میں ایک زبردست قوت تھے۔ وہ ایک مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے کچھ وقت عملی سیاست میں بھی صرف کیا لیکن اُن کی تقدیر میں سیاست دان ہونا نہیں لکھا تھا، یا فطرت نے اُنہیں ایک سیاست دان نہیں بنایا تھا۔ ہاں ایک ایسا مفکر اور مصلح ضرور پیدا کیا تھا اور اُس غیر معمولی فہم وفراست سے نوازا تھا کہ وہ اُن افکار وخیالات کی تخلیق نو اور تشکیل نو کرسکیں جو ایک ایسے سیاسی نظریے کی بنیاد فراہم کرسکیں جو ایک ایسی آئیڈیالوجی کو جنم دیں جو اگرچہ کوئی نئی آئیڈیالوجی نہ تھی (جہاں تک اسلام کا تعلق ہے) بلکہ جسے فراموش کیا گیا تھا۔

اقبال کی شاعری-ہیئت اور موضوع: اقبال نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اُن کی تمامتر منظومات زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق ہیں۔ خاص طور سے اُن کی ابتدائی نظمیں حسن وخوب صورتی کا ایک لطیف، نازک اور طبع زاد عمل۔ اقبال کی عظیم ترین شاعری کا سراغ ان کے سیاسی اور فلسفیانہ نظریات کی نسبت، حیات پر اُن کے عمیق فکر واستغراق سے مل جاتا ہے۔ اقبال کا فن جلال، جمال اور شرافت وعظمت کا حامل ہے۔ اقبال ان معنوں میں ترقی پسند تھے کہ انہوں نے فارسی اور اُردو شاعری کو طرزِ اظہار عطا کر کے کلاسیکی ادب میں مروج بہت سی مروجہ چیزوں (Conventions) کا استرداد کیا۔ اقبال کا تصورِ فن، فن برائے فن کا قائل نہ تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ فن کا ماخذ ومنبع زندگی ہے اور یہ زندگی پر اپنی اساس رکھتا ہے۔ آرٹ، اُن کے نزدیک فقط ایک تجربہ اور تخلیق نہیں بلکہ یہ عمل اور زندگی کا ایک جزو ہے۔

اقبال گوئٹے سے مماثلت رکھتے تھے اور اُن کے قرض کا انہوں نے اپنے ایک مجموعہ "پیامِ مشرق" میں اعتراف کیا ہے۔ وہ خیام یا وائلڈ کی مانند خشک مزاج اور عیاش یا عیش پرست نہ تھے۔ وہ اُمید، ایمان وایقان اور عمل کے شاعر تھے۔ وہ اپنے عظیم ہمعصر شاعر ٹیگور کی مانند بھی نہ تھے جو امید، خوشی وانبساط و طرب اور رجائیت کے شاعر ضرور تھے لیکن عمل کے شاعر نہ تھے۔ اقبال کی پختہ شاعری تحرک، فعالیت، اضطراب وبے چینی، سیمائیت، عشق اور نفس کے وقار کے قوی شعور واحساس سے عبارت ہے۔ وہ حیات کے احیاء اور مشرق کو نورِ بصیرت سے معمور کرنے کی خاطر سعی وکاوش کرتے رہے۔

گرچہ مغرب نے بھی اقبال کی بصیرت حاصل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تاہم وہ مشرقیوں کی حکمت ودانشمندی اور فلسفے کے میدان میں اُن کی ترقی اور اُن کے کارناموں کے پرجوش مدّاح تھے۔

اقبال کی شاعری شیریں ہونے کے ساتھ ساتھ جوش وجذبے اور حیات سے معمور ہے۔ وہ انسان اور تقدیر پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ وہ وجود باری تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر غیر متزلزل ایقان رکھتے تھے۔ وہ فطرت کے شیدائی تھے تاہم انسان اُن کی نظر میں بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ فطرت اس کی آغوش اور اس کا گھر ہے جس کے اردگرد انسان کو زندہ رہ کر حیرت انگیز کارنامے انجام دے کر اور معجزے دکھا کر راسخ العقیدہ ہو کر زندگی بطریق احسن کر کے مسلسل جہد وعمل میں مصروف رہنا ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کے روایتی ماضی میں دلچسپی پیدا کی لیکن ایک نئے جہان کی تشکیل کرنے کیلئے ایک فلسفہ دیا۔ وہ کلاسیکی ہونے کے ساتھ ساتھ رومانوی بھی تھے۔ کلاسیکی، ان معنوی میں کہ ماضی نے جدیدیوں کو جو کچھ دیا، اسے اقبال نے کلی طور پر مسترد نہیں کیا۔ اور رومانوی اسلئے کہ وہ انفرادیت یا فردیت میں یقین محکم رکھتے تھے اور تخیل اور فن شاعری کے عجوبات کی دنیا کے ایک عظیم موجد اور خالق تھے۔

تعلیم اقبال کی نظر میں

مغرب میں انسانی اقدار کی پامالی کے بعد دنیا کو کلی طور سے مایا یا محض خواب وخیال سمجھنے کے نتیجے میں بے یقینی، بے لگام آزادی، تشکیک اور شدید بے اطمینانی نے انسان کے باطنی سکون واطمینان اور استقلال کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس بیمار مریض مادہ پرست رویے کے خلاف احتجاج کرنا کوئی غیر فطری امر نہ تھا۔ چنانچہ ادب اور فلسفے کے شعبے یا میدان میں موضوعیت یا معروضیت (subjectivity) کے سلسلے میں خاصے ردعمل کا اظہار کیا گیا جس کی ترجمانی میری ٹین پرووسٹ (Maritian Proust) سنتا یانا (Santyana) اور کئی دیگر اہل فکر ونظر نے کی، لیکن اتنا ہی کافی نہ تھا، عقیدے اور ایمان زیادہ مثبت سطح پر بحال کرنے کی ضرورت تھی اور وہ سطح تھی، سائنس اور مادّی فلسفے کی سطح۔ لیکن کانٹم فزیکس (Quantam Physics) اور اضافیت کے نظریات نے نیوٹن کی حیثیت کو کالعدم کرنے میں بڑی سرعت کے ساتھ کام لیا، جس پر تب تک سائنسی تصورات اور اثباتی فلسفے کی اساس تھی، ایک عملی مذہب کی احتیاج بہت پہلے ظاہر ہو چکی تھی۔

بے یقینی، بے عقیدگی اور کفر والحاد کے اس دور میں اقبال کا فلسفہ یقین محکم کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اقبال کا یہ اثبات مطلق عینیت پرستوں کا جیسا نہیں، بلکہ یہ اقبال کے غیر محدود (absolute) کے سائنسی تجزیے کا نتیجہ ہے۔ اقبال نے ایک طرف مذہب اور سائنس دوسری جانب سائنس اور فلسفے کے مابین حائل خلیج کو پاٹ دیا ہے۔ اُنہوں نے حقیقت سے متعلق یک رُخے خیال کے ساتھ اہل فکر کی محض قیاس آرائی پر مبنی رویے کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اُن کا فلسفہ لابدی مذہبی، عملی، امتزاجی اور منتخبہ ہے۔ گرچہ اُنہوں نے ملت کی ساخت پر اپنی توجہ مرکوز کی تاہم آفاقی معاشرے میں ایک آفاقی کلچر کا سنگِ بنیاد رکھا۔

مذکورہ بالا امور کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اقبال کا نظریۂ تعلیم بھی امتزاجی اور منتخبہ ہے۔ یہ سائنسی بھی ہے اور مذہبی بھی۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد شخصیت کا ارتقاء ہے تاکہ انسان فطرت پر تسخیر پا کر

ماورائی رفعتوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ اقبال انسانی شخصیت کے تغیر اور ارتقاء میں یقین رکھتے ہیں تاہم برگسان اور ہربرٹ اسپنسر سے کئی معاملات یا امور میں اختلاف رائے بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے افکار لائڈ مورگن کے افکار سے کچھ مماثلت بھی رکھتے ہیں۔ لائڈ مورگن Emergent Evolution میں یقین رکھتے ہیں۔ اقبال اُن غیر معمولی شخصیات میں بھی یقین رکھتے ہیں جنہیں عطیۂ خداوندی سے نوازا گیا ہو، اور جو ارتقاء کے فطری عمل سے گذرے بغیر اُجاگر ہو سکتی ہیں۔

اقبال نے معاشرے کی نسبت فرد کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال کے یہاں فرد کے ذہن سے ملت یا معاشرے کا خیال کبھی محو نہیں ہوتا، اور یہی فرد معاشرے کی آواز ہوگا۔ اقبال افلاطون کی مانند اپنے فلسفۂ علم میں تجربہ (empiricism) اور تعقل کو آمیز کرتے ہیں۔ تاہم ایک طرح سے وہ اس سب میں خاصے تجرباتی (empirical) ہیں جس کا تجربے اور عقل (intellect) کی بدولت اکتساب کیا جا سکتا ہے۔ ان اقلیموں سے پرے وجدان کی اقلیم ہے جو عقل کی ایک اعلیٰ شکل ہے، اسلئے وہ غیر عقلی نہیں۔ اقبال عقل کا استرداد نہ کرتے ہوئے اُس عقل محض کی یقیناً مذمت کرتے ہیں جو صرف حواس پر زور دیتی ہے۔ اقبال جسم اور روح کے مساوی ارتقاء پر زور دیتے ہوئے دونوں کو حقیقت واحدہ یا اکائی تصور کرتے ہیں۔

اقبال بعض پہلوؤں میں روسو کی حقیقت پسندی اور pestalloussie اور ہربرٹ کے idealism سے بعض دیگر پہلوؤں سے متفق ہو کر تعلیم میں مطلق آزادی کے خیال سے متفق نہیں۔ وہ اس سخت نظم وضبط اور قواعد وضوابط اور اصولوں کی وکالت کرتے ہیں جن کے پیش نظر بچے کو آئندہ آنے والے وقت میں کڑی آزمائشوں کیلئے تیار کرنا چاہیے۔ اقبال ڈیوی کی صارفیت اور ہیومنزم کے مخصوص پہلوؤں سے بھی کچھ مماثلتیں رکھتے ہیں لیکن اُن کے نزدیک افادیت مادی مقاصد کے حصول تک محدود نہیں بلکہ یہ روح کی ضرورتوں کا بھی احاطہ کر کے اُن کی تکمیل کا کام انجام دے۔ اسی طرح انسان کو خدا کا عظیم شاہکار اور زمین پر اُس کا نائب یا خلیفہ قرار دے، تاہم صرف وہی انسان کے مطالعے کی شئے نہیں ہو سکتی بلکہ ذات ایزدی بھی اسی تعلیم کے ذریعے انسان کی توجہ مرکوز کر لے۔

اقبال کے نزدیک تعلیم یا علم کا سب سے اہم موضوع دین بشمول سائنس ہے۔ سائنس کو صرف مشاہدے اور تجربے کے ذریعے حاصل کیا گیا علم تصور نہ کیا جائے بلکہ یہ حق پر مبنی تمام علوم کو یکجا کر دے۔ اقبال نے تاریخ، جو علوم بشری کی نمائندہ شاخ ہے، کے مطالعے پر زور دیا ہے اور وہ قوت سے معمور ادب اور فنون بشمول فنِ تعمیر کے بھی دلدادہ ہیں۔ تاہم مجموعی اسلامی مزاج سے ہم آہنگی اور مطابقت

رکھتے ہوئے انہوں نے ڈرامہ اور تھیٹر کی مخالفت کی ہے۔ جس میں افلاطون کی روح سموئی ہوئی نظر آتی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ڈرامہ حقیقت سے تین گُنا دُور ہے۔

اقبال نے برصغیر ہندو پاک میں مروج مغربی طرزِ تعلیم کی خاص طور سے ان وجوہات کی بناء پر مذمت کی ہے۔ جہاں تک پاکستانی بیان کا تعلق ہے، یہ انتہائی سیکولر یعنی آزاد، مادیت پرست، بے مقصد اور قومی ذہانت کیلئے خاصا اجنبی ہے۔ ان اسباب کے باعث اصلیت اور تخلیقیت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اقبال کے نزدیک قدیم طرزِ تعلیم انتہائی سخت اور رسمی ہونے کے علاوہ زندگی اور اصل جدید اقدار سے عاری ہے۔ اس لئے انہیں یا تو تسلیم کیا جائے یا مخالفت کر کے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ اس لئے اقبال انہیں اسلامی سائنسی طرز پر ازسرِ نو مشرقی بنا دینے کی وکالت کرتے ہیں۔ جو کسی بھی مغربی طرزِ تعلیم کے نمونے سے مطابقت نہ رکھتا ہو، کیونکہ مغربی طرزِ تعلیم انسان کو انتشار اور باطن سے غیر ئیت پیدا کر کے بے اعتمادی، بے عقیدگی اور تشکیک میں مبتلا کر دیتا ہے۔

تعلیم کی نسبت فکر اقبال کے وسیع تناظر سے ظاہر ہوگا کہ انہوں نے اسلام کی شکستہ تعلیمی روایت سے ازِ سرِ نو رشتہ جوڑنے کی سعی کی ہے۔ اقبال کا انفس و آفاق پر زور دینا اُن اصولوں کی ازسرِ نو ترجمانی کرنا ہے، جن کی ترجمانی ایک طرف مولانا رومی اور دوسری جانب ابن خلدون اور اُن کے بعد آنے والے شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے بزرگوں نے کی۔ اقبال دین کی ازسرِ نو ترجمانی، جس میں سائنس اور مغربی اصول اور طریقے بھی شامل ہوں، اور جن میں اقبال علم کی وجدانی ہیئتوں پر زور دیتے ہیں، کے ذریعے قدیم تعلیمی طریقوں میں اصلاح کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔

تاہم کتنے تاسف کا مقام ہے کہ اپنے ہی ملک میں اقبال کا قرار واقعی مطالعہ اور ان کی صحیح طور سے ترجمانی نہیں کی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے افکار و نظریات کو مسخ کیا جارہا ہے۔ اگر آج اقبال حیات ہوتے اور اُن کا بس چلتا تو وہ اس طرح کی تمام تحریروں پر، جو اُن کی فکر پر تحریر کی جارہی ہیں۔ قدغن لگاتے۔ آج مغربی طرزِ فکر اور مغربی تہذیب کی پیش رفت کیلئے اقبال، جو مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ فکر کے عظیم نقاد تھے، سے استفادہ کیا جارہا ہے۔

فنونِ لطیفہ اقبال کی نظر میں

اقبال بہت بڑے ادبی فن کار ہونے کے علاوہ ایک ادبی نقاد (یا مفکر جمالیات) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے نظریۂ جمال کا مندرجہ ذیل اصولِ اربعہ کے تحت خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

(ا) فن احساسِ نفس یا شعورِ ذات کی رُو سے ترسیل وابلاغ کا ایک وسیلہ ہے۔ (ب) اس ترسیل وابلاغ کی ایک باقاعدہ غایت ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ نہ صرف زندگی کے خادم کی حیثیت سے مسرت کا سامان فراہم کرے بلکہ معاشرتی ارتقاء کی اثر پذیری کا کام بھی انجام دے۔ (ج) فن بنیادی طور پر ذاتی جذبے کا اظہار ہے۔ اسے اپنے سماجی یا معاشرتی انسلاکات اور وابستگیوں سے منقطع نہیں کیا جاسکتا کیونکہ فن کار کو اُسے سماج کے اُس طبقے کے لئے قابل فہم بنانا ہوتا ہے جس سے وہ خود تعلق رکھتا ہے۔ (د) حقیقی معنوں میں فن تحرک یا فعالیت کا نام ہے جو انسان میں قوت اور شان کے احساس کو بیدار کردے اور نہ صرف زندہ رہنے بلکہ نوعِ انسانی کے حقیقی ارتقاء کی خاطر جدوجہد کرنا سکھائے۔ مندرجہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال کا نظریۂ فن، فن کے مختلف تصورات کا ایک امتزاج ہے۔ جزوی اعتبار سے یہ یونان کے حکیم افلاطون کے نظریہ سے ان معنوں میں مماثلت یا مشابہت رکھتا ہے کہ وہ حسن کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ مزید براں اقبال ٹالسٹائی یا رسکن سے بھی متفق نظر آتے ہیں جو فن کو آفاقی زبان سمجھتے ہیں جسے اخلاقی مقاصد کے لئے سب کو سمجھ کر بروئے کار لانا چاہیے۔ اقبال کروچے سے بھی زیادہ دور نہیں جن کا پہلا اصول فن، فن وجدان کی حیثیت سے' کی تشریح یا صراحت پر انحصار رکھتا ہے۔ یہاں اس دعویٰ کا بھی تجزیہ کرنا ضروری ہے کہ اقبال جمالیات کی اسلامی روایت کے ترجمان تھے۔ اس کے لئے ہمیں مسلم آرٹ کی نمائندہ خصوصیات کو گنوانا ہے۔ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ آرٹ کی اسلامی روایت مذہب اسلام اور اسلامی کلچر کے حالات سے مشروط تھی۔ ابتداء میں مسلمانوں نے عضوی (organic) اور representational فنون کی نسبت خود کو جیومیٹریکل (علم اقلیدس کے متعلق) فنون میں صنعت کی کمال لطافت اور نفاست کے ساتھ ظاہر کیا۔

مسلمان فن کاروں نے پیکر انسانی یا جذبات کو بھڑکانے اور انہیں برانگیختہ کرنے والی اشیاء کی بجائے تجریدی آرٹ میں اپنی تخلیقی ذہانت اور نابغیت کو بروئے کار لانے میں خاصی مسرت حاصل کی۔ مسلمانوں کے نزدیک عملی یا افادی فن ایک لاانتہا عمل ہونے کی بدولت تکمیل کی جانب ایک وسیلہ یا عمل ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک مسلم آرٹ کی نہاد میں ایک طرح کی عملی افادیت پائی جاتی ہے۔ فن تعمیر میں مساجد، عالی شان عمارات اور مدرسوں، پیسٹک آرٹ، مٹی کے برتنوں کے نمونوں، کتابوں اور عمارات میں پھولوں کی تزئین و آرائش اور جیومیٹریکل نمونوں اور کئی دیگر فنون سے صاف ظاہر ہے کہ فن سے خوشی و انبساط حاصل کرنا مسلمان فن کاروں اور اُن کے فن کو دیکھنے والوں کا مقصد کبھی نہیں رہا ہے۔ مسلم فن کاروں کا ذہن لابدی تجرید میں انتہائی جذب وشوق کا حامل رہا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے کئی صورتوں میں انسانی ذہن کو مادیت کو سب کچھ سمجھنے کے خیال سے اُوپر اٹھا کر اس میں غیر لذتی معناں بھر کر روحانیت کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مذہب اسلام کا اصل مرجع عرب کا ریگستان تھا اور مسلمانوں کی اساس اصول توحید ہے۔ ثانی الذکر خیال نے مسلمانوں کو گہرے طور پر متاثر کر کے اُنہیں تجرید کی جانب مائل کر کے تحفظ فراہم کیا۔

مسلمانوں کے Representational Art کی نسبت جیومیٹریکل فنون سے دلچسپی لینے کے کون سے اسباب ہیں۔ پیکر انسانی سے، جو خدا کا عظیم شاہکار ہے کی شبیہہ کاری، خواہ وہ مصوری ہو، خواہ بت تراشی، لاتعلقی یا بے اعتنائی اس کا ایک سبب ہے (جس کا اُنہوں نے مذہبی بنیادوں پر جواز پیش کیا، جیومیٹریکل شکلوں یا نمونوں سے پسندیدگی انہوں نے یونانیوں کے سنہرے باب سے ورثے میں پائی۔ عرب ساری زندگی میں جیومیٹریکل قانون کی کارفرمائی میں یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ اُس ہم آہنگی یا مطابقت کے متلاشی تھے جس کے ذریعے حسن کا ادراک ممکن ہے اور جو جیومیٹریکل قانون یا اصول پر انحصار رکھتا ہے۔ یہ اعتراف عجمی ذہن سے مناسبت رکھتا ہے۔

اس حوالے سے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اُس سب کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے کبھی فنون کو سوائے فن تعمیر کے قومی وقار کا مسئلہ نہیں بنایا۔ مذہب اور علم کو اُن کے یہاں تمام اقدار سے مقدس ترین سمجھا گیا۔ فن کو کم و بیش کارآمد یا تزئین و آرائش کا عمل، موسیقی اور شاعری یقیناً مستثنیات ہیں جن کی اپنی وجدانی یا الہامی قدر و قیمت بھی ہے۔

موجودہ مغربی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہم مسلم ذہن کے ساتھ کچھ مماثلت اور مشابہت تلاش کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ سائنسی علوم کی بدولت فنون رفتہ رفتہ کمتر منصب پر دھکیلے جا رہے ہیں۔ یہ خیال کہ

فن انسان کو بلند سطح پر لے جا کر اُس کے ارتقاء کا مقصود و منتہا رکھتا ہے، سے اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ جدید ذہن، جن پر سائنسی اور عملی رویوں کا غلبہ ہے۔ representational art اور سنگ تراشی جیسے فنون کے کم ہی حامی ہیں۔ اپنے تفاعل کی بدولت فن تعمیر کی طرف زیادہ دلچسپی کا رجحان نظر آتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا ذہن مختلف اشیاء، خواہ وہ کارآمد ہوں یا تجرید کے اصول پر مبنی ہوں، خاصا مطمئن نظر آتا ہے۔

اصل مضمون سے تجاوز کرنے پر معذرت خواہ ہوں، تاہم اس کا ایک جواز یہ ہے کہ اقبال کے نظریۂ فن کی منظم تخلیقی نابغیت کی سراہنا کئے بغیر صراحت نہیں کی جا سکتی۔ بعد ازاں میں سرعت کے ساتھ اقبال کی جمالیات کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتا چلوں۔ اقبال نے مختلف فنون میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، اُنہیں فنی حسن و خوب صورتی کے شعور و احساس سے نابلد سمجھنا اُسی طرح غلط ہوگا جس طرح یہ کہنا کہ مسلم تہذیب فنون سے مانوس اور قریب نہ تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال مختلف فنون کی تقابلی قدر و قیمت کی نسبت اپنی مخصوص آراء رکھتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے فن کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ (۱) احرار کا فن (۲) محکوموں یا غلاموں کا فن۔ اقبال کی اس تقسیمِ فن کا بہ الفاظِ دیگر یوں بھی تعین کیا جا سکتا ہے۔ (۱) حقیقی آرٹ (۲) انحطاط پذیر آرٹ۔ آرٹ کی ان دونوں قسموں کی اپنی جدا جدا خصوصیات ہیں لیکن یہ بحث ذرا آگے چل کر آئے گی تا کہ اس سے چند بنیادی مسائل پر بحث کی جا سکے۔ جمالیات کے متعلق ایک اہم سوال یہ ہے کہ آرٹ کا تفاعل یا کام کیا ہے؟ اقبال نے اس کے دو جوابات دئے ہیں (۱) آرٹ کسی حد تک وجدانی ہونے کے ناتے ہمارے ادراک کی اُن اقدار کی سراہنا کو مہمیز عطا کرے جو تاثراتی شکل میں منکشف ہوتی ہیں۔ (۲) آرٹ زندگی کی فعالیت کے تئیں ہماری محبت میں سرعت اور شدت پیدا کرے۔ اس طرح آرٹ اقبال کے نزدیک نہ صرف ادراک یا قیاس کا ایک ذریعہ ہے بلکہ احساس اور ہدایت کا بھی ایک وسیلہ ہے جسے افادیت سے ہرگز علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ افادیت معمولی اور غیر معمولی دونوں معنوں میں استعمال کیا جا چکا ہے۔

میں یہاں ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے فرسودہ اور پامال موضوع کی تمہید پیش نہیں کروں گا۔ یہ راہ اس قدر پامال ہو چکی ہے کہ اب اس سے ایک طرح کی بدبو آنے لگتی ہے۔ تاہم اقبال کی جمالیات کے حوالے سے زندگی کی اصطلاح کا تعین کرنا سودمند ہوگا۔ اقبال بودلیر کے اس خیال سے ہرگز متفق نہیں کہ آرٹ کا مذہب اور اخلاق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اقبال فنون کی اخلاقی جہت یا پہلو پر خاصا زور دیتے ہیں اور مذہبی اور جمالیاتی آدرشوں کے مابین سمجھوتہ کے تاثر کے آرزومند ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں ادب کی اسلامی اقدار کے جدید ترجمان کی حیثیت حاصل ہے لیکن ایک طرح سے اقبال کا نظریہ

فنون ناقابل تنسیخ حد تک خودی اور خودی کے اصول سے مربوط یا منسلک ہے۔ یہ زندگی کا خادم یا اس کے تابع ہے۔ چونکہ خودی وجود کے اعلیٰ آدرشوں کی خاطر فرد یا قوم کی آگہی اور بیداری کا نام ہے۔ اس لئے حقیقی آرٹ کی لابدی یہ خصوصیات ہونگیں۔ اس طرح یہ اُن آدرشوں کیلئے معاون ہوگا یا اعلیٰ آدرشوں کی خاطر خودی کے لئے سعی پیہم اور ارتقاء کی پیدا کردہ ہوسکتی ہے۔

اس نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال کے مثالی فن کی تین خصوصیات ہونگیں۔ اولاً یہ اُن خیالات کی ترجمان ہوگی جیسے شانِ جلالی (grandness)۔ مقابلہ آرائی یا تعرض تسخیر اور تغلب۔ ثانیاً یہ مشاہدہ کرنیوالے کے تخلیقی ذہن میں ایک تاثر اُبھارے جو سُکر یا مدہوشی کا نہیں بلکہ وجد آفریں ہو۔ بعدازاں یہ سوز و گداز پیدا کرے، لیکن انجمادی نوعیت کا نہیں بلکہ مثبت، دلسوز اور رقت انگیز۔

اقبال کے جمالیاتی نظریے پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس پر بے جا طور پر فلسفۂ قوت کا غلبہ ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریئے کی رُو سے محبت کی اہمیت کے پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ (یہ ایک ایسا اصول یا آدرش ہے جو ذاتی ایثار اور قربانی کا متقاضی ہے)۔ بظاہر یہ اعتراض قابل قبول معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم جدوجہد یا کشمکش میں یقین کریں جس طرح اقبال نے کیا ہے (جو فطرت اور ارتقاء کا بھی ایک مستند اصول یا قانون ہے) تو اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ کشمکش یا جنگ کا نہ صرف ایک جواز ہے بلکہ یہ انسانی ارتقاء کیلئے بنیادی ضرورت ہے۔ اگرچہ نتیجہ صحیح ہے تو یہ واقعتاً ہیبت ناک ہے کیونکہ موجودہ صورت حال میں کوئی جنگ تمام نوع انسانی کیلئے ماتمی گھنٹہ کی آواز کے مترادف ہوگی۔ لہٰذا کشمکش اور تسخیر کا خیال بہت سے لوگوں کے نزدیک زندگی کو تحفظ فراہم کرنے کے بجائے اسے نیست و نابود کرنے والا ہوگا لیکن حقیقت اس سے بعید بھی ہے اور اقبال نے اس کی صراحت یا تشریح بھی کی ہے۔

اقبال نے بین طور پر فطرت پرستوں کی پیروی کی ہے۔ یہ ایک بعید العقل بات ہوسکتی ہے کیونکہ اقبال نے اپنے جمالیاتی نظریات کی رُو سے فن کار سے اپنا فن فطرت کی تحدید سے آزاد کرنے کی ہدایت کی ہے (فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو) تاہم انہوں نے ایک مختلف طریقے سے فطرت پرستوں کا اثر بھی قبول کیا ہے اور غالباً بڑی دانشمندی سے کام لیا ہے کیونکہ آرٹ اور سائنس کے تصادم میں انسان کو برگشتہ خاطر ہو کر ہی سہی، سائنسی حقائق کی قوتوں کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

بے سوادی سے کہیں تو انسان ہنوز ایک جانور یا حیوان ہے۔ قانونِ فطرت نے انسان اور حیوان میں جذبۂ حیات موجود ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ پوری کائنات میں تسخیر (یا وجود) کیلئے کشمکش جاری ہے۔ اس لئے یہ ایک ایسا قانون ہے جو زندگی کی نفی کے بجائے اس کا

اثبات کرتا ہے۔ اقبال کے فلسفے میں ایثار و قربانی کا تصور بھی معدوم یا غائب نہیں ہے۔ اُن کا نظریۂ جمال کسی بھی صورت میں نری مثالیت میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ اُس ترجمانی یا مظاہرہ کی مذمت کرتے ہیں جو کمزوری، تناؤ اور محرومی اُبھارنے والی کیفیات اور خیالات کو اُجاگر کرنے والا ہو۔ اقبال اُن موضوعات یا مضامین کی، جو زندگی کے متعلق خوف اور ابہام کے احساس کو اُجاگر کریں، مذمت کرتے ہیں۔ حقیقت پسند آرٹ کی اگرچہ وہ کھلے طور پر مذمت نہیں کرتے تاہم اس کی انہوں نے حوصلہ شکنی ضرور کی ہے، کیونکہ اس طرح کے موضوعات فطری طور پر بھدے، رزیل، بیمار، پست، غلیظ اور کمینہ پن کے قسم کے خیالات کی لفظی تصویریں ہونگیں۔

واقعہ نگاری یا حقیقت نگاری کی اپنی خوبیاں اور خصوصیات ہونگیں لیکن اب اسے رزالت، بدصورتی اور پھوہڑپن سے منسوب یا منسلک کیا جاتا ہے۔ اس طرح اقبال نے اس نوع کی ترجمانی کی حمایت نہیں کی، کیونکہ یہ لازمی طور پر جلال (شان اور شرافت و عظمت) سے عاری ہوگی۔ حقیقت پسندی کے اس مسلک کی مذمت میں اقبال تن تنہا نہیں، ہربرٹ ریڈ بھی یہ کہہ کر اُن کی ہمنوائی کرتے ہیں کہ حقیقت نگار ادیب بالعموم وہ ہے جو زندگی کے ایک خاص پہلو پر زور دے انسانی عظمت و شان میں اس کی کارفرمائی نہ ہونے کے برابر ہے۔

لیکن المیہ کیا ہے؟ المیہ یونانیوں کے نزدیک مانا ہوا بلکہ یقیناً عظیم ترین فن ہے۔ لیکن اقبال کو المیہ کو نرے برانگیختہ یا مشتعل کرنے والے پہلو میں یقین رکھنے والا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ یہاں تک کہ وہ کتھارسس کے خیال کا، المیہ کے ایک فعل کی حیثیت سے اختلاف بھی کریں کیونکہ زندگی کے دیگر تمام حقائق کی مانند وجود اور ترقی کے تمام عوامل کی ہر نہاد میں کارفرما رہتا ہے۔ المیہ ایک طرح سے ہماری روزمرہ زندگی میں ہر لمحہ ایفا کرتا ہے، جو زندگی کی نشوونما اور ارتقاء کا ایک عمل ہے، پھر المیہ کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بدولت اسے کچھ غیر معمولی اور خاص دلچسپی کے اہل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے کوئی صراحت نہیں کی ہے تاہم ڈرامہ (تمثیل) کی نسبت اُن کا تمام تر رویہ اس سمت کی جانب اشارے کرتا ہے۔

فطرت نگاری ایک عظیم فلسفے کی حیثیت سے جمالیات کا ایک ہر دلعزیز اصول اور عمل ہے۔ فطرت نگاری کے سادہ لفظوں میں یہ معناں ہیں کہ فطرت کی اشیاء کی معروضی انداز میں ترجمانی کی جائے۔ بغیر کسی تصریح و تعبیر یا ترمیم کے۔ فطرت کی ترجمانی یا مظاہرہ اُسے کہا جائیگا جو ایک غیر متاثر شدہ انسان کے لئے ایک الگ وجود رکھتا ہو۔ گرچہ خود انسان فطرت ہی کی ایک شئے ہے۔ اس میلان نے

متعدد سمتوں میں اپنی نمود، جن پر یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم حوالے کے طور پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ فطرت پرستوں نے مجموعی طور پر اپنے گردوپیش کی خارجی یا ظاہری دنیا کی لغوی یا لفظی نقل کے تئیں اپنی لاتعلقی اور بے اعتنائی ظاہر کی۔ وہ چیزوں اور اشیاء میں کسی مخفی معناں کو تسلیم کرنے کے منکر ہوئے اور فطرت میں اصلاح یا تہذیب کی مخالفت کی۔

جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے، اقبال فطرت نگاری کے تئیں چند مخصوص دائروں سے اپنی ہلکی سی رغبت کے باوجود اس اصول کے سخت مخالف نظر آتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ اقبال نقل کے نظریہ میں بالکل یقین نہیں رکھتے۔ فن کار کہیں نہ کہیں سے متاثر ہوتا ہے اس لئے اُسے چاہیے کہ وہ قارئین یا مشاہدین کیلئے متاثر کن صورتوں اور شان وشوکت کے انداز میں اصول وضع یا خلق کرے تاکہ وہ مثالی حسن کا ادراک کرکے ان کی سراہنا کرسکیں، جو فطرت میں موجود نہیں بلکہ فطرت سے پرے خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ فطرت میں جو کچھ پہلے سے موجود ہے، فن کار اس کی تکمیل کرنے کے علاوہ اس میں اضافہ کرے۔ نری نقالی سے احتراز کرتے ہوئے نقالی کا کام انجام دے۔ مزید براں فن کار فطرت کی ازسرِ نو ترجمانی کرے لیکن اس کی ظاہری شباہت یا صورت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے اپنے دقیق اور مخفی تجربے کی روشنی میں۔ اس مخفی پہلو کو کئی ماہرین بشمول کروچے نے تسلیم کیا ہے اور یہ پہلو اقبال کے جمالیاتی تصورات کی اساس میں کارفرما ہے۔ اقبال کے نزدیک نقل پر مبنی فطرت نگاری فن کار کی اصلیت اور اُس کی انفرادیت کو تباہ کرکے رکھ دیتی ہے کیونکہ ایسا کرتے ہوئے وہ محض ایک نقال ہوگا۔ جب کہ ایک حقیقی آرٹسٹ کی بنیادی صفت اُس کی اصلیت ہے۔ انحطاط پذیر یا اخلاق کو نظر انداز کردینے والا فن فکر ونظر کے اعتبار سے اصلیت سے عاری ہوتا ہے۔ آرٹ اور ادب پر فرائڈ کے اثرات کی بھی اقبال نے مذمت کی ہے کیونکہ فرائڈین پوری زندگی کی جنسی رویوں کے تناظر میں ترجمانی کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ اقبال کی نظر میں زندگی کے کتنے ہی برتر انسانی اور روحانی مقاصد، جو انسان کی جنسی امنگوں سے کہیں زیادہ دیگر پہلوؤں کو متاثر کرتے ہیں۔ سررئیلسٹ (Surrealists) جو بالخصوص فرائڈ سے متاثر ہیں، اقبال سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ وہ انسانیت کو اصل وجود کی عملداریوں سے خارج کردیتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک حسن مطلق کا ایک مثالی وجود ہے جس کیلئے محنت اور کوشش کو بروئے کار لایا جائے۔ مثالی حسن کو مثالی بنا کر پیش کیا جائے نہ کہ اقدار کی بیخ کنی کی جائے، جو کہ سررئیلسٹس کا طریقۂ کار ہے۔ موجودہ ادیب کیوبزم قسم کے تجریدی آرٹ پر اقبال کے خیالات سے ناواقف ہے۔ تاہم یقیناً تجریدی فنون کے تئیں اقبال کا میلان اور جھکاؤ اسلامی طرز کے جیومیٹریکل آرٹس کی جانب زیادہ ہے۔

جدید تجریدی آرٹ سے بعض لوگ یقیناً خائف ہونگے لیکن یہ ایک مجموعی یا فطری عمل ہے کہ تجریدی آرٹ ہمیشہ اپنے دور کا مظہر یا ترجمان رہا ہے۔ جب کہ لوگوں کی اکثریت سائنسی اور ریاضیاتی حقائق میں خاصی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ مذہب اسلام کی ترویج واشاعت کی تاریخ کا عجمی دور لازمی طور پر سائنس اور عملیات کا دور تھا۔ اسلئے مسلمانوں کا جیومیٹریکل اور زیبائشی یا آرائشی آرٹ میں دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ اقبال نے اسلامی فنِ تعمیر کی عظیم یادگاروں جیسے مسجد قرطبہ کی خاصی پذیرائی کی۔

فنون میں اقبال کی ترجیح مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ شاعری، موسیقی، فن تعمیر اور مصوری۔ شاعری کسی خیال کو جذبہ واحساس بنادینے کا ایک شاندار وسیلہ ہے۔ موسیقی سب سے زیادہ تجریدی فن ہے (اور شوپن ہاوَر جیسا کہ اُن کے نزدیک تمام فنون موسیقی کی حالت وکیفیت کے آرزومند ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ یہ روحِ انسانی کو وجودِ اعلیٰ کی راہ پر گامزن کرتی ہے)۔ فنِ تعمیر صلابت و پائیداری اور دین کے تئیں سنجیدہ رویے کی علامت ہے۔ اور سب سے آخر میں مصوری، جو حسن کی پیشکش اور ترجمانی کا ایک طریقہ ہے۔ تاہم مصوری کی اپنی بہت سی حدود یا کوتاہیاں ہیں۔ اس میں حرکت کا فقدان ہے۔ یہ جامد اور ساکن ہے۔ یہ خود کو وقت کے اندر وسعت دینے سے قاصر ہے۔ یہ تمام پہلو فکر اقبال کی روح کے متوازی ہیں۔

پیکر انسانی کا بیان یا تصویر کشی فطرت نگاری کا جزو ہے جس میں انسان اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اقبال دیگر پہلوؤں کے لحاظ سے انسان دوست ضرور ہیں لیکن نقل پر مبنی فنون کی اُنہوں نے کسی بھی طور حمایت نہیں کی ہے۔ ابھی بھی ایک سوال ایسا ہے جو لابدی بحث طلب ہے، وہ یہ کہ مسرت کی نوعیت کیا ہے جو فنون کی بدولت مشاہد یا فن کار کو حاصل ہونی چاہیے۔ پہلے فن کار کو لیں، فن کار کی مسرت، اُس کی یہ بیداری اور آگہی وعرفان ہے کہ اُس نے کوئی ایسی چیز تخلیق کی ہے جو اس کے سامعین (یا قارئین یا مشاہدین) کیلئے باعث مسرت ہے۔ اپنے جذبات کی ترجمانی کے باعث اُسے اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ دونوں طریقوں سے فن کار وہ مسرت حاصل کرسکتا ہے جسے ایک طرح کے روحانی تجربے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ فنون کو زیادہ تر مذہب سے وابستہ کیا گیا ہے اس لئے یہ تجربہ ایک قسم کا مذہبی تجربہ ہے۔ فکر اقبال کی رُو سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے انسان سے ہی مغرب نے آرٹ کی صورت اختیار کی لیکن تہذیبِ انسانی کی بتدریج ارتقاء پذیری کے بعد مذہب بھی فنکارانہ سرگرمی یا فعالیت کی نسبت دانشورانہ قوتِ عمل کے قریب آتا گیا، اس لئے فنون مذہب کے تابع ہوگئے۔ اقبال کی نظر میں مذہبی تجربہ فنی تجربے سے زیادہ اطمینان بخش ہے۔

اگر چہ آرٹ ایک قسم کا داخلی اور مسرت بخشنے والا تجربہ ہے تو دینی تجربہ فن کار اور اس کے سامعین (یا قارئین) کو لازمی طور پر زیادہ اطمینان بخشے۔ آرٹ ایک طرح کا جامد یا غیر متحرک عمل ہے۔ مذہبی تجربہ لازمی طور پر انسانی ترقی کیلئے اپنی پسند یا خواہش کے مطابق تحرک یا عمل کا وسیلہ ہے۔ اقبال کے مصرعے ۔ شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر، کے یہی معناں ہیں۔ اس کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ فنون تہذیب کے زوال کا باعث یا نتیجہ ہیں جیسا کہ میکالے اور بکل دونوں کا یہی خیال ہے۔

مختصراً اقبال فن کارانہ عمل یا سرگرمی کے مخالف نہیں لیکن وہ مذہبی تجربے کے مقابلے میں فنون پر توقف یا اُن پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے حق میں ہرگز نہیں، فن کارانہ تجربہ اور مذہبی تجربہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں لازم و ملزوم یا ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ اگر ثانی الذکر یعنی مذہبی تجربے سے یا اس کی قوت سے اس کی ابتداء کی جائے تو اس صورت میں دونوں کے درمیان مغائرت ختم ہو کر رہ جائیگی۔

بعض جدید ناقدینِ فن نے سائنسی ترقی کے زیر اثر فن کارانہ عمل میں افادی عنصر پر زور دیا ہے۔ اسے مجموعی طور پر عملیات کا نام دیا جاتا ہے جو سائنسیات کا ایک ظہور بھی ہے۔ اس خیال کی رُو سے فنون کو خواب آور تصور کیا جاتا ہے جو واقعتاً مسرت بخشنے والا ایک ذریعہ ہے لیکن ساتھ ہی افادی عمل کو مفلوج کر دینے والا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر کیف انہیں بعض وجوہات کی بناء پر اقبال فنون کی بعض صورتوں کیلئے بہت زیادہ اشتیاق کو قبول نہ کرنے پر آمادہ ہوئے جیسا کہ بعض علل بالکل ٹھوس، قوی اور مستحکم معلوم ہوتے ہیں۔

فنون کے تئیں اقبال کے اس مذہبی اور سائنسی رویے کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فنون کا کوئی مستقبل نہیں۔ ذاتی طور پر میرا جواب اس سلسلے میں نفی میں ہوگا۔ لیکن اس کا انحصار تنقید فن کے معیار میں کچھ ترمیم یا فنون کے تئیں ہمارے رویے میں اصلاح پر ہے۔

فنون کے حوالے سے یہ یاد رہے کہ موجودہ دور سائنس، ریاضیات اور افادیت کا دور ہے۔ دوم فنون کا معاشرتی یا سماجی مقصد صاف اور واضح ہونا چاہیے۔ چنانچہ معاشرے کے سماجی معیار کے ساتھ اس کی ہم آہنگی ہو۔ اس سلسلے میں مذہب کی بات آتی ہے۔ مذہب، مجموعی طور پر فن کا مخالف نہیں لیکن بعض اوقات انحطاطی قسم کے فنون مذہب کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس تضاد کو ختم کر دینا ناگزیر ہے۔ بروس الوپ کے الفاظ میں (فنون کے مستقبل میں) آرٹ، مثلاً

سائنس اور مذہب کے پاس ایک ایسا طریقہ ہے جس کی مدد سے ہمیں روشنی عطا کی جاسکتی ہے۔ اسلئے دونوں کے مابین کوئی بنیادی مغائرت نہیں''۔ تیسرے ہمیں مذہب اور سائنس کے خلاف فنون پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فقط آرٹ کے سہارے زندگی نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کے معناں اُس بھرپور اور مکمل انسانی تجربے کے ہیں جس کے پھلنے پھولنے یا نشوونما پانے اور ثمر آور بننے کیلیے آرٹ اور مذہب وسائنس کے متعلق ایک امتزاجی نظر پیدا کرنے کی احتیاج ہے۔

COMPLIMENTARY BOOK
NCPUL, NEW DELHI